پڑوسن

آمنہ اقبال احمد



سب تعریفیں اللہ ہی کیلیئے ہیں۔

2006ء

ارسلان بک کارپوریشن

نام کتاب .... پڑوسن

مصنفہ .... آمنہ اقبال احمد

کمپوزنگ .... سید اویس قرنی جنگی سٹریٹ قصہ خوانی پشاور

مطبع .... آصف ٹیٹین پریس، لاہور

تعداد 600

قیمت .... -/170روپے

اسٹاکسٹ

طیبہ بکسٹال پبلشرز اینڈ بک سیلرز
Ph.7320318
0301-4072442
الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور پاکستان

اپنی بات

میں اپنی معزز قارئین پر واضح کرنا چاہتی ہوں۔ کہ زیر نظر ناول 'ہر آہ اک طوفان' ہی ہے۔ اسکا نام میں نے بدل کر 'پڑوسن' رکھ لیا ہے۔ کیونکہ کہانی خدانخواستہ ٹریجیڈی نہیں ہے بس نام سے بہت آہیں نکل رہی تھیں۔ یہ نام میں نے اپنی ایک دوست کے مشورے پر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ بہت اداس سا نام تھا۔ اسلیئے مجھے تسلی نہیں تھی۔ اب اسے بڑے سائیز میں چھپوانے لگی تو سوچا نام بھی اپنی مرضی کا رکھ لوں۔ سو بدل کر 'پڑوسن' رکھ لیا ہے۔

میری دوست نے بھی برا نہیں منایا۔ آپ بھی امید ہے اس تبدیلی کیلیئے مجھے معاف کریں گی۔ Inconvenience کیلیئے معذرت خواہ ہوں۔ آپکی محبتوں کی بہت مشکور ہوں۔

آمنہ اقبال احمد

Some day winter will ask summer :
'Have you seen spring lately?'

کین کے فرنیچر سے آراستہ لکڑی کے بنے اس خوبصورت سے پہاڑی ریسٹورانٹ میں وہ دن میں ایک بار تو ضرور اپنی شیپر ون کیساتھ آ کر بیٹھتی۔ بڑی سی چوڑے چوڑے شیشوں والی کھڑکی کے قریب لگی میز پر بیٹھ کر وہ اور اسکی پچاس پچپن سالہ شیپر ون چائے آئس کریم یا کوئی کولڈ ڈرنک پیتیں اطراف کے جنت نظیر ماحول سے محظوظ ہوتیں خوب خوب گپ شپ کرتیں ــــ کہ شیپر ون اور بقول انکے خود اس کی پھپھو باتوں کی بہت شوقین تھیں۔ یہاں وہاں گھومنے پھرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ پرفضا مقامات پر خاص طور سے یہاں آنے کا اور ٹھہرنے کا تو ہمیشہ ہی پروگرام بناتی رہتیں۔

یخ ٹھنڈے کوک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی وہ چونکی۔ ریسٹورانٹ کے باوردی مستعد بیرے نے کسی کیلئے دروازہ کھولا تھا۔

ایک لمبے قد، وجیہہ شخصیت کا حامل قریباً ستائیس اٹھائیس برس کا آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ اجنبی تھا اس علاقے میں شاید۔ اس نے پہلے اسے یہاں نہیں دیکھا تھا۔

"Good Morning Sir." بیرا مرعوب سا بولا۔

"Morning." متانت سے کہتا وہ آگے بڑھا۔

اسکی چال میں وقار تھا، بڑی بڑی سیاہ چمکتی ذہین آنکھوں میں کمانڈ اور انداز میں کسی مطلق العنان فرمانروا کی شان!

وہ سامنے کی کونے والی میز پر گیا۔ بیرے نے اسکے لئے کرسی پیچھے کھسکائی، وہ بیٹھا۔

"بلیک کوفی ــــ سٹرونگ اینڈ ــــ ہاٹ اور ــــ جلدی"۔ اس کی خمار آلود بھاری سی آواز میں کسی مختار کل کی جھلک تھی۔

"ہوٹل میں کوئی نیا مہمان آیا ہے شاید" ۔ پھپھو متجسس لہجے میں بولیں۔ "ہم لوگ تو کافی عرصہ سے آرہے ہیں یہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا" ۔ وہ نظر کا چشمہ اوپر نیچے کرتیں، فوکس برابر کرتیں اشتیاق سے کہہ رہی تھیں۔

شائی کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ پھپھو کو آج کیلئے یہ نیا ٹوپک کافی تھا۔

"کسی بڑے گھر کا لگتا ہے" ۔ وہ اس طرف سے نظریں پھر کر شائی کی طرف دیکھنے لگیں۔ "خاصے ٹھاٹ باٹ ہیں..." وہ مزید بولیں۔

شائی نے ایک سرسری نظر سامنے ڈالی۔

ڈارک گرے قیمتی سوٹ میں ملبوس، اپنے چوڑے مضبوط شانوں اور لمبے قد کی وجہ سے وہ واقعی بہت امپریسو لگ رہا تھا۔

نظریں اپنی ڈرنک پر جماتی وہ پھر سے پینے میں مصروف ہوگئی۔

تبھی اس نے محسوس کیا، اس نے قیمتی برینڈ کی سگریٹ سلگائی تھی۔ سگریٹ کی مہک اس کی پرفیوم کی مدھر خوشبو میں گھل مل کر اطراف کو سحر انگیز بنانے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں بیرا اس کیلئے کوفی لے آیا۔

آج بیرا معمول سے زیادہ چاق وچوبند ہو رہا تھا۔

کھڑکی کے نیچے کھائی میں بھری اتھل پتھل ہوتی کہر پر نظریں جمائے وہ کھائی کا پرلا سرا دیکھنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

"ہمیں آئے پورے تین دن گزر گئے۔ لائین ٹھیک ہو تو ٹیلی فون کی تو بات ہو بھائی صاحب سے" ۔ پھپھو فکرمندی بولیں۔

وہ رشتہ میں شائستہ کے پاپا کی دور پار کی ایک غریب رشتہ دار تھیں۔ شائستہ کی ممی شائستہ کی پیدائش کے دو سال بعد ہی کار ایکسیڈنٹ میں انتقال کرگئیں تو شائستہ کے پاپا صلاح الدین صاحب نے انہیں شائستہ کی دیکھ بھال کے لئے بلوالیا۔ وہ بچاری بھی بیوہ تھیں، کوئی اولاد بھی نہ تھی، بس شائی کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ کر پالا پوسا۔ پندرہ سال کے عرصے میں وہ شائی

کو اپنی اولاد کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ صلاح الدین صاحب نے بھی انہیں بڑی بہن کہہ رکھا تھا۔ نوکر چاکر، دور پار کے لوگ انہیں اسی نسبت سے عزت دینے لگے تھے۔

"شاکر کاکا نے نچلے ٹاؤن میں جاکر فون پر ہماری خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کردی ہے"۔

شاکر ڈرائیور تھا انکا۔ اترائی پر واقع قریبی قصبے میں فون قدرے آسانی سے مل جاتا تھا۔ وہیں جاکر اس نے صلاح الدین صاحب کو اطلاع کردی تھی۔

"ہاں بیٹا وہ تو ہے۔ پر تم سے خود بھی بات ہوجاتی تو زیادہ تسلی ہوتی انہیں"۔

"ہوں..."

معاً۔۔۔ غیرارادی طور پر اس کی نظریں سامنے اٹھیں۔

کوفی کے گھونٹ حلق سے اتارتا۔۔۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اسکی نظریں خودبخود جھک گئیں اور وہ پھر سے کھڑکی کے اس پار دیکھنے لگی۔

کوک ختم کرکے وہ پھپھو کی چائے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ نظریں جانے کیسے ایک بار پھر سامنے اٹھیں۔

وہ کوفی ختم کرچکا تھا۔ بڑے دلکش انداز میں سگریٹ کے کش لیتا، دھوئیں کے مرغولے بناتا اس وقت پھر اسے غور سے گھور رہا تھا۔

وہ کچھ سٹ پٹا سی گئی۔ پھپھو نے چائے ختم کرلی تھی۔

بیرا آیا اس نے پے منٹ کی اور پھپھو کو ساتھ لئے ریسٹورانٹ سے باہر آگئی۔

ہر سو بادل گھر آئے تھے، بجلی کڑکنے لگی تھی، بدلیاں گرجنے لگی تھیں اور سردی بڑھنے لگی تھی۔

اوپر اپنے سوئیٹ تک پگڈنڈی پر جاتے جاتے اسے اس آدمی کا خیال آیا۔ بہت ڈیشنگ تھا۔ بلیک، سٹرونگ اینڈ ہاٹ کوفی پیتا تھا، قیمتی برینڈ کا سگریٹ پیتا تھا اور اسکے پرفیوم کی مدھر مہک اسکے ذوق کا پتہ دیتی تھی!

"بیٹا ہمارے پیچھے والے سویٹ میں کوئی آیا ہے۔ دیکھو اوپر۔۔۔"

اس نے اوپر دیکھا۔

بادلوں میں لپٹے اونچے سر بفلک سبز پائینز اور ہریالی میں گھرے سرخ کھپریل کی ڈھلانی چھتوں والے ہوٹیل کے کئی خوبصورت سوئیٹس اوپر تلے، ادھر ادھر بکھرے نظر آرہے تھے۔

اسکی نظریں بائیں طرف اونچائی پر واقع اپنی سویٹ سے ہوتیں اس سے بھی اوپر اپنے پاس والے سویٹ پر گئیں۔

واقعی سویٹ آباد ہو چکا تھا۔ دو آدمی سامنے نظر آرہے تھے۔ ایک علاقائی لباس شلوار قمیض پہنے تھا اور دوسرا سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔

دفعتاً بارش کے موٹے موٹے قطرے پڑنے لگے۔

"تیز چلو شائی بیٹا۔۔۔ ابھی جل تھل پانی برسنے لگے گا۔ یہاں کے موسم کا تمہیں پتہ ہی ہے"۔ پھپھو تیز تیز چلنے لگیں۔

مگر جلدی ہی سانس پھول گیا۔ وزن بھی خاصا تھا اور پھر بقول انکے اب عمر کا بھی تقاضا تھا۔

"آپ تھک گئی ہیں پھپھو۔ آہستہ چلیں پہنچ ہی جا

"ہاں بیٹا"۔ انکی رفتار واقعی سست پڑ گئی۔

سویٹ قریب آچکا تھا۔ اپنے چھوٹے سے برآمدے میں پہنچتے پہنچتے اسکی نظریں سامنے پڑیں۔

"میں چلتا ہوں۔ مسٹر خان نیچے ریسٹورانٹ میں ہیں یہ رین کوٹ دیتا ہوں"۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص دوسرے معمر آدمی سے بولا تھا۔

"ہاں جلدی چلیں"۔ معمر آدمی نے کہا۔

پہلا شاید۔۔۔ کوئی ملازم خاص تھا اور دوسرا بھی کوئی ملازم ہی تھا غالباً۔

ہنوز برآمدے میں کھڑی بارش سے محظوظ ہوتی اس نے دیکھا۔

سیاہ سوٹ والا آدمی اپنے سر پر کالی چھتری کھولے بازو پر فان کلر کا رین کوٹ لئے تیزی سے پگڈنڈی اتر رہا تھا۔

"آپا دوپہر کیلئے کیا پکاؤں؟" خانساماں، انہیں دیکھتے ہی برآمدے میں آگیا۔

صلاح الدین صاحب کے دیکھا دیکھی سبھی ملازم انہیں آپا کہتے تھے۔

"بہت دیر کردی۔ گوشت نہیں مل رہا تھا کیا؟"

آج وہ گوشت لینے گیا تھا۔ ورنہ اس وقت تک وہ کام نمٹا چکا ہوتا تھا۔

"ہاں آپا۔ یہاں تو ملا نہیں۔ بس سے گیا ہوں نیچے والے گاؤں میں۔ وہاں سے مل گیا"۔

"بتا دو بیٹا کیا دل کرتا ہے آج کھانے کو"۔ پھپھو شائی سے مخاطب ہوئیں۔

"صاحبو کاکا کوئی مزیدار سی چیز۔ مگر مرچ کم۔۔۔"

خانساماں کا نام صاحب دین تھا جو بقول پھپھو شائی نے ہی بچپن میں بگاڑ کر صاحبو کر دیا تھا۔ وہ اگر صاحبو کاکا سے لاڈ کرتی تھی تو وہ بھی اسے اپنے بچوں سے کم نہ جانتے تھے۔

"مرچ کم۔۔۔ خاک مزا آتا ہوگا کھانے کا تمہیں بھی"۔ پھپھو حسب معمول بڑبڑائیں۔

"پھپھو آپ مٹھی بھر بھر مرچ اوپر تو ڈال ہی لیتی ہیں"۔

"لیکن مرچ کا جو مزا سالن میں پک جانے کے بعد ہوتا ہے وہ اوپر ڈالنے سے نہیں آتا"۔

وہ مسکرادی۔ 'ہاں' کبھی نہ کرپاتی کہ مرچیں کھانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

معاً اس کی نظریں نیچے پڑیں۔

فان کلر رین کوٹ میں وہی آدمی اسی پگڈنڈی پر اوپر چلا آرہا تھا۔ زوردار بارش میں بھی اسکی چال میں استحکام تھا، انداز پروقار اور شخصیت میں دبدبہ تھا۔

اسکا ملازم خاص اس سے ایک قدم پیچھے آرہا تھا۔

انکے برآمدے کے آگے سے گزرتا دو چار قدم کی ڈھلان چڑھتا اپنی سویٹ پر پہنچا تو۔۔۔ سفید کپڑوں والا بوڑھا ملازم مؤدب کھڑا تھا اور سیاہ سوٹ والا اسکا رین کوٹ اتار۔۔۔

لگا تھا۔

جو بھی تھا ___ بڑا اسمیشنگ، ڈیشنگ اور بلاشرکت غیرے کسی ملک کا حکمران تھا جیسے!

صاحبو کا کا کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ چھوٹے سے کچن میں شاکر بھی سردی کے مارے سمٹا سمٹایا انکے قریب بیٹھا تھا۔ پھپھو بھی وہیں کرسی پر بیٹھیں گرم گرم چائے کے گھونٹ لیتیں ان دونوں سے باتوں میں مصروف تھیں۔

وہ اپنے ساتھ لائے ڈھیر سارے ناولوں میں سے ایک نکال کر اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے پاس رکھی آرمڈ چیئر پر بیٹھتی ناول کے بیک پر نظریں دوڑانے لگی۔

ایک عرب پرنس اور ایک پریس رپورٹر کی دلچسپ لوسٹوری لگ رہی تھی۔ مسحور سی ہوتی اس نے کتاب کا پہلا صفحہ پڑھنا شروع کیا۔

اسے دلچسپ اور ہلکے پھلکے رومانس بہت اچھے لگتے تھے۔ ایف اے کے پیپرز دیتے دیتے وہ سوچتی کب امتحان ختم ہونگے' کب وہ پہاڑ پر پہنچے گی اور کب ڈھیرے سارے ناول پڑھے گی۔

رات ہی وہ پہلا ناول ختم کر چکی تھی۔ یہ دوسرا تھا۔ گھنگھور گھٹاؤں اور جل تھل برستی بارش سے لطف اندوز ہوتی وہ پڑھنے لگی۔

''شائی بیٹے آؤ کھانا لگ گیا ہے''۔ پھپھو کی آواز اسکے کانوں میں آئی تو وہ چونک اٹھی۔

''آئی پھپھو'۔ کتاب بند کرتے ہوئے وہ سامنے کے Living room میں آ گئی۔

یہ لِونگ روم ڈرائننگ، ڈائننگ سبھی کچھ تھا۔ ایک طرف قیمتی صوفہ لگا تھا، ٹی وی تھا۔ دوسری طرف کونے میں چھوٹا سا ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں لگی تھیں، پاس ہی چھوٹا سا فرج بھی تھا۔

صاحبو نے مرغی چاول اور بھنڈی گوشت بنائے تھے۔ دونوں اسکی پسندیدہ چیزیں تھیں۔

پھپھو اور وہ کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

''شاکر بتا رہا تھا ہمارا پڑوسی مہمان بہت بڑا کارخانے دار ہے۔ کئی کئی انڈسٹریوں کا اکیلا مالک ہے۔ باہر کے ملکوں میں بھی کاروبار پھیلا ہے۔ اس والے سویٹ میں خود رہتا ہے،

ساتھ والا سویٹ اسکے بوڑھے ملازم کا ہے اور پچھلے دو میں سے ایک میں اسکا پی اے، دوسرے میں ڈرائیور ہوتا ہے۔ اسکے گارڈ الگ سویٹ میں مقیم ہیں...'' پھپھو چاولوں کے اوپر ڈھیر سارا اچار ڈالتے ہوئے بتانے لگیں۔

اس کا انداز بھی بتا رہا تھا۔ اس نے سوچا!

''اس کے بوڑھے ملازم کا نام اسماعیل ہے۔ اس نے شاکر کو بتایا ہے کہ اس نے اسے گودوں پالا ہے۔ پانچ سال کی عمر سے اس کی پڑھائی کے سلسلے میں اسکی دیکھ بھال کے خیال سے اسکے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں رہا ہے۔ ابھی ڈھائی تین ماہ قبل ہی وہ وطن واپس آیا ہے...''

پھپھو نے حسب عادت خاصی معلومات جمع کر لی تھیں اسکے متعلق۔

''پھپھو جو کتاب میں نے آج شروع کی ہے بہت دلچسپ ہے''۔ اس نے کہا۔ کہ وہ پھپھو کی معلومات میں انکا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

''کتنا کہتی ہوں آنکھیں خراب مت کرو۔ کل تک امتحان اور اب کمبخت یہ سٹوریاں...''

وہ اسکے پڑھنے کی عادت سے نالاں لگ رہی تھیں۔

''آپکو کیا پتہ کتنا مزا آتا ہے پڑھنے میں''۔

''اور کل کو جوان خوبصورت آنکھوں پر عینک لگ گئی تو؟''

پھپھو کو واقعی اسکی کچھ کھوجتی ہوئی بڑی بڑی ارغوانی، کاسنی مائل، بہت حسین آنکھوں کی فکر رہتی۔

''لینز لگاؤں گی۔ پتہ ہی نہیں چلے گا نظر کمزور ہے''۔

''سو بہانے بنانے لگتی ہو۔ مگر یہ کبھی مت کہنا کہ پھپھو آئندہ زیادہ نہیں پڑھوں گی...''

''زیادہ نہیں۔ بس یہ کتابیں ختم کرونگی جو ساتھ لائی ہوں'' وہ انہیں چھیڑنے لگی۔

پھپھو اسکی اس عادت سے اسلئے بھی ناراض رہتیں کہ پھر انکے ساتھ بات کرنے کیلئے شائی کے پاس وقت کم ہی ہوتا۔ ساری کسر انہیں صاحبو اور شاکر کے پاس جا کر اتارنا پڑتی۔

پھپھو اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتیں میز سے اٹھنے لگیں۔

''اچھا پھپھو کوشش کرونگی کہ کم پڑھوں۔بس آپ ناراض مت ہوا کریں''۔

''میری جان میں بھلا تم سے ناراض ہوسکتی ہوں''۔انہوں نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

''اولاد سمجھ کر پالا ہے تمہیں۔خدا کو جواب دونگی اگر کم سمجھا ہو تو...'' ان کی آنکھیں فرط جذبات سے نم ہونے لگیں۔

اور شائی انکے گلے لگ گئی۔پاپا کے بعد وہی تو تھیں انکی سب کچھ۔چند ثانیے یوں ہی ان سے چمٹی رہی۔

''اب پڑھوں جا کر''۔وہ انکی طرف ملتجی انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''پڑھو۔تمہیں اتنا اچھا لگتا ہے تو۔میں دعا کرونگی کہ تمہاری نظر کبھی کمزور نہ ہو اور تمہاری یہ خوبصورت آنکھیں کبھی عینک کے شیشوں کے پیچھے نہ چھپیں''۔

''اچھی پھپھو''۔اس نے انہیں گال پر بوسہ دیا۔

پھر۔۔۔بیڈ روم میں چلی آئی۔

بارش اب بھی برس رہی تھی۔گو رفتار میں کمی آچلی تھی۔بادلوں کی گرج دھیمی پڑ گئی تھی اور بجلی کی کڑک اب باقی نہیں رہی تھی۔

وہیں چوڑی خوبصورت کھڑکی کے پاس آکر وہ دوبارہ آرمڈ چیئر پر بیٹھ گئی۔پھر سے ناول کھول لیا۔پھر سے سلسلہ جوڑ لیا۔اور تھوڑی ہی دیر میں وہ دوبارہ منہمک ہوگئی۔

ابھی دو ہی صفحے پڑھے تھے کہ وہ چونکی۔نظریں بائیں جانب اٹھیں۔وہی تھا۔اسکی کھڑکی سے دو ہی قدم کی اونچائی پر بنے اپنے برآمدے میں آنکلا تھا۔

سفید قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔اس وقت وہی سیاہ سوٹ والا آدمی جو شاید اس کا پی اے تھا،وہیں کھڑا تھا۔شائی کی نظریں کچھ اور آگے بڑھیں۔سویٹ کی پرلی طرف دو مسلح آدمی مختلف پوزیشنوں پر الرٹ کھڑے تھے۔تو یہ گارڈز تھے اسکے!

شائی کی نظر گھڑی پر گئی۔دو بجنے والے تھے۔

May I go with you sir? اسکا پی اے بولا تھا۔

''No, thank you.'' وہ متانت سے بولا تھا مگر خواب آور آواز میں دبدبہ تھا۔

پھر۔۔۔وہ نیچے جاتی پگڈنڈی کی طرف بڑھا۔

یقیناً نیچے ریسپشن کے پاس بنے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں لنچ کیلئے۔

وہ پھر سے پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

پھپھو نے نماز پڑھی۔وہیں لونگ روم میں صوفہ کھولتے ہوئے بیڈ بنا کر لحاف اچھی طرح اپنے گرد لپیٹیں تھوڑی ہی دیر میں خراٹے بھرنے لگیں۔

انہی خراٹوں کی وجہ سے تو وہ لونگ روم میں سونے لگی تھیں۔انہیں معلوم تھا انکے زوردار خراٹوں کی وجہ سے شائی ٹھیک سے سو نہیں پاتی تھی۔ورنہ تو جنگل کے اس سناٹے میں،کڑکتے گرجتے بارشوں کے طوفان میں جنگلی درندوں کے خوف سے وہ اکثر آدھی رات کو ہی آکر انہیں یہاں سے اٹھا لے جاتی۔

گھر کی بات الگ تھی۔دونوں کے بیڈ روم پاس پاس تھے۔اور اسے وہاں اکیلے ہی سونے کی عادت تھی۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد انکی آنکھ کھلی۔شال اچھی طرح لپیٹتیں وہ کچن میں آگئیں۔بارش رک چکی تھی،سنہری دھوپ نکل آئی تھی۔صاحبو اور شاکر کچن سے باہر بیٹھے نیچے بل کھاتی سڑک پر آتے جاتے ٹورسٹس پر نظریں جمائے گپ شپ میں مصروف تھے۔

انہوں نے چائے بنائی۔صاحبو اور شاکر کو دی،خود بھی وہیں انکے پاس کرسی پر بیٹھ کر پینے لگیں۔

فارغ ہوئیں تو شائی کی طرف آگئیں۔

''بیٹا چائے پیو گی یا وہی موئی ٹھنڈی پیپسی۔اُف توبہ۔سردی بھی نہیں لگتی...''

وہ اب کے کرسی کے بجائے اپنے بستر میں گھسی کہنی کے سہارے سر ٹکائے رخ کھڑکی کی طرف کئے ہنوز کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔

''ہاں پھپھو پیپسی''۔وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔

شائی نے گھڑی دیکھی، پانچ بج رہے تھے۔کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سیدھی ہوتے ہوئے اس نے سر تکیوں کے سہارے، بستر کی پشت سے ٹکالیا۔

تبھی اسکی نظریں بائیں طرف کھڑکی سے اس پار گئیں۔

ہوٹیل کا نیا گیسٹ عام جینز اور جیکٹ پہنے اپنے سوئٹ کی پرلی طرف کھڑا تھا، پاس ہی بوڑھا ملازم تھا اور ایک سائیس اچھا صحتمند گھوڑا تھامے منتظر کھڑا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھوڑے پر سوار ہوا، اسے ایڑھ لگائی، تیزی سے مختصر سی چڑھائی طے کی اور اس پار اترتے اترتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہ اسے کسی دیو مالائی کہانی کا شہزادہ لگا۔خوبصورت، بے خوف اور بہادر!

پھپھو اس کیلئے پیپسی اور اپنے لئے بچی ہوئی چائے دوبارہ گرم کرتیں کپ میں ڈال کر لے آئیں۔

''اچھا ہے بارش رک گئی ہے۔مجھے یہاں کی ہر بات پسند ہے مگر بارش طول پکڑنے لگے تو ہول اٹھتے ہیں''۔پھپھو گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتیں بولیں۔

''اور مجھے یہ جگہ بمعہ طول پکڑتی بارشوں کے پسند ہے۔بوندیں پڑنے سے جب چھت بجتی ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے''۔

''بیٹا تمہاری جوانی ہے اور میرا بڑھاپا''۔پھپھو ہنستے ہوئے بولیں۔''تمہاری عمر کی تھی تو مجھے بھی بادل اور بارش اچھے لگتے تھے مگر اب بارش زیادہ ہونے لگے تو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے''۔

پیپسی کا آخری گھونٹ لیتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔باتھ روم گئی، چہرے پر ٹھنڈے یخ پانی کے چھینٹے دیئے۔ڈریسنگ روم آکر میرون رنگ کے کپڑے پہنے۔گرے جوگرز، گرے جیکٹ پہنی اور کمر تک پہنچتے سیاہ گھنے لہریئے دار خوبصورتی سے ترشے بالوں پر برش کرتی کمرے میں آگئی۔پھپھو وہیں تھیں۔

''چلیں پھپھو۔نیچے پارک میں چلتے ہیں''۔

''چلو بیٹا''۔گھومنے پھرنے کیلئے وہ شاذ ہی 'نا' کرتی تھیں۔خالی کپ اور پیپسی کی خالی بوتل اٹھاتیں وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔''ذرا یہ چپل بدل لوں۔پھسلتی ہوں پھر''۔

کچن میں کپ اور بوتل رکھ کر وہ شائی کے ڈریسنگ روم میں آئیں، انکا سامان یہیں ہوتا تھا۔بوٹ پہنے اور شائی کیساتھ باہر نکل آئیں۔

پارک میں حسب معمول چہل پہل تھی۔یہاں اسی طرح ہوتا تھا۔بارش کے وقت سب اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبک جاتے تھے۔پھر جوں ہی موسم کھلتا جوق در جوق امڈ آتے تھے۔

پھپھو اپنی ایک ہم عمر دوست کیساتھ ایک طرف بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگیں۔وہ پہلے جھولے پر جھولتی رہی۔اس کے بعد ایک لڑکی کیساتھ 'سی سا' پر جا بیٹھی۔

''چلیں پھپھو سموسے کھاتے ہیں''۔'سی سا' سے فارغ ہوکر وہ پھپھو کے پاس آگئی۔

اسکا اشارہ قریبی اونچائی پر واقع چھوٹے سے بازار کی طرف تھا۔بازار چھوٹا تھا پر ضرورت کی ہر شے میسر تھی۔گرمیوں کے مارے دور دراز سے آدھمکے سیاحوں کیلئے یہاں کے دوکاندار ضرورت کی ہر چیز مہیا کرتے تھے۔اور پھر کھانے پینے کے ان چھوٹے چھوٹے کھوکھوں پر تو خاصی رونق ہوتی تھی۔

''چلو''۔وہ بھلا انکار کرسکتی تھیں۔ایک تو شائی کی خواہش اوپر سے اپنا شوق۔

اور تھوڑی دور چل کر وہ گرم گرم چائے سموسوں اور پکوڑوں کی دکان میں لکڑی کے میز اور بینچ پر جا بیٹھیں۔

مزے لے لے کر دونوں نے گرم سموسے کھائے۔پھپھو نے ایک چائے کا کپ بھی پیا اور دونوں واپس آنے لگیں۔

''ایک منٹ پھپھو۔'میری گوراؤنڈ' پر بھی چکر لے لوں''۔دوبارہ پارک کے قریب آتے ہی وہ بولی۔

''چلو جاؤ بیٹھو، میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں''۔وہ سڑک کے قریب ہی سبزے پر بیٹھ گئیں۔

شام کے سائے ملگجے ہو رہے تھے۔ ٹھنڈ مزید اتر آئی تھی اور پارک میں بس اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔

وہ برابر 'میری گو راؤنڈ' پر گھوم رہی تھی۔

تبھی اسکی نظر اپنے بائیں پڑی۔ وہی مہمان تھا۔ گھوڑے پر سوار قریبی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس وقت اسکی نظریں اس پر جمی تھیں اور جیسے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ تھی۔

غیر ارادی طور پر وہ رک گئی ـــ یہ موہوم سی مسکراہٹ اسکے 'میری گو راؤنڈ' میں اس قدر انہماک پر ہی تھی شاید! موہوم سی مسکراہٹ مبہم سی مسکراہٹ میں بدل گئی۔ اب کے یہ مبہم سی مسکراہٹ اسکے اچانک ٹھٹھک جانے پر تھی شاید!

وہ آگے بڑھتے ہوئے پکی سڑک پر ہولیا۔ اور شائی پھپھو کی طرف آ گئی۔

پھر وہ دونوں بھی اسی سمت ہوٹیل کی طرف ہولیں۔ بل کھاتی سڑک پر خاصی چڑھائی تھی۔ پھپھو کا دم پھولنے لگا تھا۔

"ستالیں تھوڑا سا پھپھو"۔

اور پھپھو واقعی سڑک کے کنارے بیٹھ گئیں۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

شام کے سائے اتر آئے تھے، اوپر تلے، یہاں وہاں بکھرے چھوٹے چھوٹے گھروں میں روشنیاں ٹمٹمانے لگی تھیں اور ـــ شام کی پکوانوں کے دھوئیں اٹھنے لگے تھے۔

دونوں پھر آہستہ آہستہ اپنے ہوٹیل کی طرف بڑھنے لگیں۔

آج ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام نہیں تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ بتی روشن تھی اور کھلی کھڑکی کے پردے کھلے تھے۔

وہ جھٹ سے آگے بڑھی۔ اب پہلے والی لاپروائی نہیں برتنی چاہیئے تھی۔ کیونکہ پہلے اس طرف کا سویٹ خالی تھا اور اب اس میں گیسٹ آ چکا تھا وہ بھی ملازموں کی فوج کیساتھ۔

وہ پردے برابر کرنے لگی۔

"مسٹر خان کتنے بجے ڈنر کرتے ہیں"۔ ہوٹیل کا بیرا سامنے برآمدے میں کھڑے گیسٹ کے پی اے سے پوچھ رہا تھا۔

"نو بجے شارپ"۔

"یہاں لے آؤں"۔

"نہیں۔ وہ خود ہی ڈائیننگ ہال میں جائینگے"۔

"بہتر"۔ بیرا پلٹ کر چل دیا۔

کھڑکی سے ہٹ کر اسکی نظر خواہ مخواہ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی پر جا پڑی۔

پونے نو تھے، پندرہ منٹ رہتے تھے ابھی اسکے ڈنر میں۔

ڈریسنگ روم جا کر اس نے رات کے کپڑے پہنے۔ منہ دھو کر کولڈ کریم لگائی۔ کمرے میں آتے ہوئے بستر میں گھس کر ادھ پڑھے ناول کو اٹھایا ہی تھا کہ یاد آیا باہر برآمدے کی ریلنگ پر اس نے گیلا تولیہ اور جرابیں پھیلائیں تھیں سکھانے کیلیئے۔ رات کو بارش ہو جاتی تو بمشکل سوکھا تولیہ دوبارہ گیلا ہو جانا تھا۔ وہ جلدی سے بستر سے نکل آئی۔ کھڑکی کے پاس رکھی کرسی کی پشت پر سے اپنی جیکٹ اٹھائی اور پہنتے ہوئے باہر نکل آئی۔

وہیں ریلنگ کے پاس کھڑی تولیہ تہہ کرتی وہ وادی میں جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کو تکتی رہی۔

تبھی اسکی نظریں بائیں جانب اٹھیں۔ گیسٹ کے برآمدے کی ٹیوب لائیٹ میں اس نے دیکھا۔ اسکا پی اے اسکے لئے دروازہ تھامے کھڑا تھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس وہ باہر آ رہا تھا۔ یقیناً ڈنر پر جانے کیلیئے۔

"سر میں ساتھ چلوں"۔ اس وقت پھر اسکا پی اے بولا تھا۔

"نو ـــ تھینک یو"۔ گو دھیمی تھی آواز اب بھی مگر تنبیہہ سی لئے تھی۔

وہ اکیلا ہی پر وقار انداز میں چلتا نیچے اسکے قریب سے پگڈنڈی اترنے لگا۔ تو اس کے پرفیوم کی وہی مدھرتا ماحول کو مدہوش کرتی گئی۔

اپنی جرابیں اٹھاتے اٹھاتے اس نے دیکھا۔ اسکا ایک گارڈ پہلے ہی آدھی پگڈنڈی طے کئے ایک طرف چوکس کھڑا تھا۔ دوسرا جانے کہاں پوزیشن لئے تھا۔ بہت قیمتی انسان تھا۔

اس نے کندھے اچکائے اور ــــ

واپس مڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔

صبح سات بجے ہی اسکی آنکھ کھل گئی۔ سستی سے اٹھتی وہ حسب عادت کھلی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

اردگرد کہر کا جال سا بنا ہوا تھا۔ کیا کھائیاں کیا گھاٹیاں سبھی دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ اسکے باوجود قد آور پائنز اپنے گہرے سبز رنگ لئے نمایاں ہو رہے تھے اور ــــ سنہری دھوپ کی ٹھٹھرتی کرنیں کہر میں سے جھانکتیں ادھر ادھر پھیلتی جا رہی تھیں۔

ماحول سے مسحور وہ پلٹنے کو ہی تھی۔ کہ اچانک نظر دور اوپر کچھ فاصلے پر ہائیکنگ ٹریک پر پڑی۔ وہی پاس کے سویٹ والا گیسٹ تھا۔ جینز جیکٹ پہنے ٹریک پر واپس آ رہا تھا۔

جانے کس وقت جاگا تھا، صبح ہی صبح واپس بھی آ رہا تھا!

یوں ہی کندھے اچکاتی وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

رات۔ کے کپڑے بدل کر اس نے جوگیا رنگ کے گرم کپڑے پہنے۔ ڈرٹی گرین سلیولیس سویٹر پر ڈرٹی گرین جیکٹ پہنی، ڈرٹی گرین ہی شوز پہنے۔ بالوں میں برش کر ہی رہی تھی کہ پھپھو نے ناشتے کیلئے آواز دے دی۔

''صاحبو اور شہباز خان کے بوڑھے ملازم اسماعیل میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے''۔

پھپھو پراٹھے سے انڈا کھاتے ہوئے گویا ہوئیں۔

تو ـــ قریبی گیسٹ کا نام شہباز خان تھا! شائی مسکرا دی۔

''صاحبو کا کسی علاقے میں موجود ہونگے اور دوست نہیں بنائینگے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اس نے صاحبو کو بتایا ہے کہ شہباز خان کا نزدیک کا کوئی رشتہ دار نہیں۔ بس وہ ہے اور اسکی نانی۔ اور نانی اسکو ہی اپنی زندگی سمجھتی ہیں۔ اسکو ہی دیکھ کر جیتی ہیں...''

وہ پھر مسکرادی۔

"آپ بھی تو مجھے دیکھ کر جیتی ہیں..." وہ ٹوسٹ پر چھری سے مارملیڈ لگاتے ہوئے بولی۔

"بس بالکل ایسا ہی معاملہ ہے شہباز خان کا اور اسکی نانی کا"۔ پھپھو خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

"پھپھو آج پکنک پر جائینگے۔ صاحبو کاکا کو کہتے ہیں کھانا جلدی بنالینگے اور سب باہر جا کر کھانا کھائینگے..."

"بس بیٹا تم نے میرے دل کی بات کہہ دی"۔

پھپھو لاکھ عمر میں پچپن کی سہی، عادتیں بالکل چھوٹوں جیسی تھیں۔ سیر سپاٹے کی بے حد شوقین تھیں۔

"صاحبو کاکا کو چاہیئے آج ہمیں مزیدار لنچ بنا کر دیں"۔ شائی بولی۔

"ایسی چیزیں تیار کرواؤنگی کہ میرا بیٹا دیکھ کر خوش ہوجائیگا"۔ پھپھو محبت سے کہنے لگیں۔

"اور تب تک میں ناول پڑھونگی۔ آج ختم کرنا ہی ہے اسے"۔

"پڑھو پڑھو"۔ پھپھو پکنک کے خیال سے ہی بہت دریادل ہوگئی تھیں۔

اپنے بیڈروم میں آکر حسب معمول کھلی کھڑکی کے پاس آرمڈ چیئر پہ بیٹھ کر اس نے ناول کھول لیا۔ پڑھنے لگی۔

چندہی صفحے پڑھے تھے کہ قریبی سویٹ کے برآمدے میں کراکری اور کٹلری کی کھنک سے اسکی محویت ٹوٹی۔ نظریں بائیں جانب گئیں۔

قریبی گیسٹ اپنے برآمدے میں کرسی پر بیٹھا اخبار پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ اور ___ ہوٹیل کا بیرا اسکے آگے رکھی میز پر ناشتے کے برتن لگا رہا تھا۔

فارغ ہوکر بیرا خالی ٹرے لئے مؤدب طریق سے پیچھے ہٹتے ہوئے برآمدے سے نیچے اتر گیا۔

اخبار پر نظریں جمائے جمائے ہی اس نے میز پر سے اورنج جوس کا گلاس اٹھایا اور دھیرے دھیرے سِپ لیتا اخبار دیکھتا گیا۔

گلاس خالی کر کے اس نے میز پر رکھا۔ اور اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

شائی ناول پڑھ رہی تھی۔ مگر گاہے گاہے نظریں اسکی طرف اٹھ جاتیں۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوچکا تھا۔ چائے کے کپ سے گھونٹ گھونٹ پیتا وہ برآمدے میں اپنی طرف بڑھتے ہوئے بادلوں کے یلغار سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لگتا تھا سحرانگیز ماحول کے ایک ایک پل کو اپنے اندر جذب کرلینا چاہتا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی، سوا نو بج رہے تھے۔ دوبارہ نظریں کتاب پر جمادیں۔

جانے کہاں [illegible]؟ کتاب ہی سے کہیں لپٹا شاید۔ ایک کیڑا اس کی گود میں آگرا۔

"پھپھو"۔ کتاب [illegible]ے پھینکتی، دامن جھٹکتی مارے گھبراہٹ کے چیختی چلاتی وہ باہر برآمدے میں بیٹھی پھپھ[illegible]ی طرف بھاگی۔

"کیا ہوا؟" و[illegible]ں سے بھی زیادہ پریشان ہوگئیں۔

"ک۔ کیڑا تھا۔ [illegible]ی گود میں آگرا"۔ اسکے خوبصورت چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا، حسین پرپلش آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور مارے پریشانی کے زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔

"کیسا کیڑا تھا؟" پھپھو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بس کیڑا تھا نا"۔

"بڑا تھا؟"۔ وہ اندر کی طرف بڑھنے لگیں۔

"نہیں... تھا تو اتنا سا"۔ اس نے ناخون بھر سائز بتایا۔ اور ___

ساتھ ہی اسے لگا وہ گیسٹ اسے دیکھ رہا تھا۔ دوچار ہی قدم پر تو تھا اس کا برآمدہ انکے برآمدے سے!

غیر ارادی طور پر اسکی نگاہیں اُس طرف اٹھیں۔

اس وقت پھر اسکے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ تھی۔ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتا وہ گرم چائے سے اٹھتی بھاپ کے اس پار دیکھ رہا تھا۔

وہ خفیف سی ہوگئی۔ پھپھو کیساتھ اندر آ گئی۔

چھوٹا سا کیڑا اور کتاب دونوں اب بھی فرش پر پڑے تھے۔

پھپھو نے کتاب اٹھا کر اسکی کرسی پر رکھی۔ اور اسکے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس میں احتیاط سے کیڑا اٹھاتیں وہ باہر کی طرف بڑھیں۔

''تمہارے بھی کیا کہنے ہیں۔ اتنے سے کیڑے سے طوفان مچا دیا۔ آگے زندگی میں جانے کیا کیا آئیگا...''۔ وہ شفقت کیساتھ ساتھ تشویش سے کہتیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

شائی چپکے سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کتاب کھولتے کھولتے ایک بار پھر نظریں سامنے اٹھیں۔ گیسٹ کی نظریں اس وقت اسکی کھڑکی کا طواف کر رہی تھیں۔ اب کے شاید وہ اس کے بیٹھنے کی جگہ جان گیا تھا۔

اسکی نظریں ہٹیں تو شائی نے جلدی سے کرسی پیچھے کھسکا لی۔ اب وہ اسکی نظروں کی زد سے دور ہوگئی تھی۔

وہ ناول پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ کبھی کبھی ایک نظر ادھر بھی پڑ جاتی ۔۔۔ بیرے نے شاید اسکے آگے سے ناشتے کے برتن سمیٹ لئے تھے۔ آرم چیئر کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے ٹانگیں میز کے نیچے سیدھی پھیلا دی تھیں۔ اور جس انداز میں وہ سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر لائیٹر سے سلگاتا، کش لگاتا۔ وہ انداز بہت یونیک تھا۔

پڑھتے پڑھتے اسے گیارہ بج گئے۔ کافی دیر پھپھو اسکی طرف نہیں آئی تھیں۔ کتاب بند کرتے ہوئے وہ کچن کی طرف گئی۔ پھپھو وہاں بھی نہیں تھیں۔ صاحبو کاکا پکنک پر ساتھ لے جانے کیلئے بریانی، چکن، قیمہ اور پراٹھے بنانے میں مصروف تھے۔

''صاحبو کاکا۔ پھپھو کہاں ہیں؟''

وہ اس وقت یا تو باہر برآمدے میں تسبیح کا ورد کر رہی ہوتیں یا پھر کچن میں صاحبو کاکا سے چائے بنوا کر پیتے ہوئے اخبار پر نظریں دوڑاتیں مختلف سرخیوں پر ان سے تبادلۂ خیال کرتیں۔

''انکے سر میں درد تھا۔ اپنے بستر میں ہیں، سر درد کی گولی اور چائے دیکر آیا ہوں...''۔

وہ سیدھی انکے پاس جا پہنچی ۔۔۔ مگر وہ سو رہی تھیں۔ آہستہ قدم چلتے وہ برآمدے میں آ گئی۔ ادھر ادھر اطراف پر نظریں دوڑاتی وہ چند ثانیے وہیں کھڑی رہی۔

آج دھوپ تھی، ہر سو چہل پہل تھی، رونق تھی۔

نیچے ہوٹیل کے ریسپشن سے قدرے فاصلے پر بنے اپنے فیورٹ ریسٹورانٹ پر نظر پڑتے ہی اسے کوک کی طلب ہوئی۔ اندر گئی، جوگرز پہنے اور پگڈنڈی اترتی سیدھی ریسٹورانٹ پہنچ گئی۔

اندر داخل ہوئی۔ کوک آرڈر کیا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

جہاں وہ اور پھپھو اکثر بیٹھتی تھیں وہ جگہ کسی اور نے لے رکھی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور ایک اور کھڑکی کے آگے بیٹھ گئی۔

کوک آنے کا ابھی انتظار ہی کر رہی تھی کہ نظر سامنے کے کونے والی ٹیبل پر پڑی۔

وہی تھا۔ انکا پڑوسی گیسٹ ۔۔۔ کوفی کے سپ لیتا اسی کو دیکھ رہا تھا!

جانے کیا ہوا اسے؟ ہڑبڑاتے ہوئے سیدھی بیٹھ گئی۔ اتنا قریب تھا وہ۔ اگلی ہی میز پر۔ اور اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

اس نے دیکھا۔ اس کے پرکشش لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اس وقت تو اسکی اس مبہم سی مسکراہٹ کا ساتھ اسکی بڑی بڑی سیاہ نیلی آنکھیں بھی دے رہی تھیں۔

سٹ پٹا کر اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے وہ رخ پیچھے موڑ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگی۔

اسکی کوک آ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے پینے لگی۔ اب کے اس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا ہی نہیں۔

پتہ نہیں کیا بات تھی؟ وہ اسکا سامنا کرنے سے گھبرا جاتی تھی۔ اس سے بہت بڑا سا تھا شاید اسلیئے، بہت رعب اور دبدبے والا تھا شاید اسلیئے، !مگر۔۔۔

وہ اسکی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر متبسم بھی ہو جاتا تھا، اسکی نظریں اسکی طرف اٹھتیں تو وہ اسے اپنی طرف دیکھتا بھی نظر آتا تھا، اسکی نظروں میں کچھ عجیب سا تاثر بھی ہوتا تھا۔

وہ جان نہیں پاتی تھی جسے!

تاثر !اپنائیت کے جیسا، پسندیدگی کے جیسا اور... اور... شناسائی کے جیسا!

یہ سب کیوں تھا؟ اس نے سر جھٹکا۔ ان مشکل باتوں کو وہ واقعی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

گو اسکا دل اس وقت آئس کریم کھانے کو بھی چاہتا تھا مگر اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ خالی بوتل میز پر رکھتے ہوئے وہ کاؤنٹر پر آئی، پے منٹ کی اور باہر نکل آئی۔

جانے کن سوچوں میں گم وہ پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی کہ اچانک پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی۔ تبھی دو مضبوط بازوؤں نے اسے سہارا دیا اور وہ گرنے سے بچ گئی۔

نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہی تھا۔۔۔ شہباز خان۔ اسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

سٹ پٹاتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا۔ اور دھڑکتے دل کیساتھ تیز تیز چلتی اوپر اپنے سویٹ میں چلی گئی۔

اس نے اسکا شکریہ بھی ادا نہیں کیا کہ جس حساب سے وہ پھسلی تھی شاید نیچے تک پہنچ کر ہی رہتی۔ وہ تو اتنی گھبرا گئی تھی کہ سارے آداب بھول گئی تھی۔ بلکہ اب تو وہ شاید اسکا سامنا بھی نہ کر پاتی۔

وہ بہت چھوٹی تھی، مشکل سے سترہ سال کی، اور پھر ایسے حالات کا اسکا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اسکی تو کل کائنات بس پاپا اور پھپھو تھے۔ صاحبو کا کا اور باقی ملازم تھے یا پھر کالج اور

کالج میں دو ایک فرینڈز۔۔۔ اسکی زندگی گھر سے کالج، کالج سے گھر یا پھر چھٹیوں میں ادھر ادھر کی سیر تک محدود تھی۔

پھپھو کا سر درد ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کھانا وانا ساتھ لے کر صاحبو اور شاکر کے ہمراہ دو میل پر واقع ایک بہت خوبصورت جگہ پر پکنک منانے چلی گئیں۔

انہوں نے مزیدار کھانا کھایا، تھرمس میں سے گرم گرم چائے پی۔ ادھر ادھر گھومے پھرے۔۔۔ واپس سویٹ پر پہنچے تو دو بجنے میں ابھی بھی چند منٹ باقی تھے۔

وہ بستر میں گھس گئی، اسکے ناول میں ابھی چند صفحے رہتے تھے ختم ہونے میں۔ سونے سے پہلے وہ اسے ختم کرنا چاہتی تھی۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے ناول بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے اٹھا لیا۔

دو ہی صفحے پڑھ پائی تھی کہ چونکی۔

وہ ٹھیک دو منٹ کم دو بجے پر نیچے جانے کیلئے تیار تھا۔

بہت Manly تھا وہ۔ اسکا سرخ و سفید دھوپ میں تپا تانبے کی مانند رنگ اسکے آؤٹ ڈور سپورٹس میں دلچسپی کی ضمانت تھا، پرکشش نقوش کیساتھ بہت شاندار فزیک سے نوازا تھا قدرت نے اسے۔ آف وائیٹ کوٹ اور ڈارک گرے پینٹ میں ملبوس وہ کوئی گریک گوڈ لگ رہا تھا۔

حسب سابق اپنے پی اے کو اپنے ساتھ جانے سے منع کر دیا تھا۔

"I want to enjoy all this—All alone."۔ وہ All alone پر زور دیتے ہوئے بولا تھا۔ اس بار جیسے تیزی سی تھی اسکے لب و لہجے میں۔

"Sir."۔ پی اے مؤدب تھا۔

وہ نیچے چل دیا۔۔۔ اسکا پی اے اور بوڑھا ملازم اسماعیل بابا وہیں پیچھے رہ گئے۔

"شہباز خان پہلے ہرگز ایسے نہیں تھے۔ اتنا کچھ خدا نے دے رکھا ہے مگر تکبر اور تلخی نام کو نہیں۔ یہ سب حالات کی وجہ سے ہے..."۔ اسماعیل بابا گویا اسکے

لگے تھے۔

"مگر پابندی نام کی چیز شہباز خان برداشت نہیں کر پاتے"۔ پی اے مسکراتے ہوئے بولا۔"ہر جگہ میری موجودگی تو برداشت کر لیتے ہیں مگر ہر پل کی اپنے گارڈز کی پہرہ داری سے سخت نالاں رہتے ہیں..."

"ہاں"۔ اسماعیل بابا مسکرائے۔"اس بار تو الجھ ہی پڑے بیگم صاحبہ سے۔ انکا اصرار کہ گارڈز ساتھ جائینگے اور شہباز خان کی تکرار کہ کم از کم یہاں تو انہیں اکیلا رہنے دیا جائے۔ مگر بیگم صاحبہ بھی تو رسک نہیں لے سکتیں۔ جھکنا ہی پڑا شہباز خان کو انکے آگے مگر اس شرط پر کہ دور دور رہیں گے انکے گارڈز ان سے۔ بیگم صاحبہ نے ہاں تو کہہ دی مگر وہاں سے روانگی کے وقت مجھ سے بولیں انہیں ہرگز اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ حفاظت کے خیال سے بھی اور ڈاکٹروں کی تاکید کی وجہ سے بھی۔ مگر..." بابا ایک بار پھر مسکرا دیئے۔"شہباز خان کے آگے تھوڑی چلتی ہے کسی کی۔ اپنی ضد کے بہت پکے ہیں۔ مجال ہے انکی مرضی کے خلاف کوئی کام ہو اور خاص طور سے بیماری سے اٹھنے کے بعد تو بہت ہی تلخ ہو گئے ہیں..."

"بہت تلخ۔ بات بے بات سب کو ڈانٹتے رہتے تھے۔ جبھی تو ڈاکٹرز نے تبدیلیٔ آب و ہوا کیلئے کہا"۔ پی اے بولا۔

اسماعیل بابا نے گہری سانس لی۔

انکی گہری سانس سے اس کیلئے انکے Concern کا پتہ چلتا تھا۔ مگر ___

کیا وہ بیمار تھا؟ کیا بیمار تھا؟

کم از کم اسے تو وہ بالکل بیمار نہیں لگا تھا۔ ہاں اس وقت جو پی اے کیساتھ تیزی برتی تھی وہ ذرا چونکا دینے والی تھی۔

ان لوگوں کی آپس میں اور کیا گفتگو ہوئی؟ وہ اس نے نہیں سنی کہ وہ کتاب ختم کرنے میں لگ گئی تھی۔

سو کر اٹھی تو پانچ بجنے میں چند منٹ تھے۔ کمبل پرے ہٹاتے ہوئے وہ باتھ روم

گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی، جیکٹ پہنی، بالوں پر برش کیا اور پھپھو کے پاس باہر برآمدے میں نکل آئی۔

وہیں کرسی پر بیٹھیں وہ چائے پی رہی تھیں۔ جب سے پڑوس آباد ہوا تھا پھپھو اس طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے لگی تھیں۔ آگے بڑھتے ہوئے شائی انکے مخالف والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھپھو اسکے لئے چائے بنانے لگیں۔

"کتاب ختم ہو گئی؟"۔ میز پر اس کے آگے کپ رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"ہاں پھپھو۔ بہت مزے کی تھی"۔

"چلو شکر ہے..."۔

"ابھی اور بھی بہت سی ہیں"۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔ ڈھیر میں نے دیکھی ہے"۔

"پھپھو چائے کے بعد نیچے پارک میں چلیں گے"۔

"ضرور چلیں گے۔ تم چائے پی لو"۔

اور تبھی کئی مردانہ آوازوں پر چونکتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا۔

بالکل کل والے ٹائم پر ایک طرف سائیس گھوڑا تھامے کھڑا تھا۔ اور اس طرف قدرے ہٹ کر پانچ، چھ آدمی کھڑے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں فائلیں، کاغذات وغیرہ تھے، اور وہ باری باری شہباز خان سے کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔

"سر۔ یہاں آپکے سائن چاہئیں"۔

یہ پروڈکشن آفیسر سلمان تھا۔ کھلی فائیل پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اس نے سائین کر دیئے۔

"تھینک یو سر"۔ سلمان ایک طرف ہو گیا۔

"سر۔ ہالینڈ سے ٹیولپ کمپنی کے مالک کا آپ کیلئے فیکس میسج ہے۔ ایکسپورٹ کونٹریکٹ کے بارے میں..."۔ دوسرا آدمی چند کاغذات لئے آگے

اور یوں ایک کے بعد ایک وہ سب اسکے آگے پیش ہوتے رہے۔رپورٹ دیتے رہے۔

وہ سائین کرتا رہا، جلدی جلدی، سرسری سرسری جواب دیتا رہا۔

پھر گھوڑے کی جانب بڑھا۔اسماعیل بابا ساتھ ساتھ تھے۔

اسے جیسے یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔چہرے کے مضبوط پرکشش نقوش تناؤ کی زد میں آگئے تھے۔

''بابا۔ان کو یہاں کا راستہ کس نے بتایا؟'' وہ شاید بابا کی بہت عزت کرتا تھا۔بڑے ضبط سے بولا۔

''بیٹا آپکا کہیں آنا جانا چھپا تھوڑی رہ سکتا ہے۔اور پھر ان کی بھی مجبوری ہے۔آپ سے ڈسکس کئے بغیر کام بھی تو نہیں چل سکتا۔'' بابا نے اسکا تناؤ دور کرنے کیلئے نرمی سے سمجھایا۔

''مگر بابا۔مجھے تنہائی چاہیئے۔کیا یہاں بھی میں سکون سے نہیں رہ سکتا''۔اسکے لہجے میں کرب کی جھلک تھی۔

''خدا آپکو سکون دے بیٹا۔میں سمجھا دونگا انہیں، بیگم صاحبہ سے بات کرلیا کرینگے''۔

''اچھا بابا۔میں چلتا ہوں''۔اس نے رکاب میں پاؤں رکھا۔

''جائیں بیٹا''۔بابا نے شفقت سے کہا۔

اور وہ گھوڑا حسب سابق تیزی سے بھگاتا چڑھائی کے اس پار اتر گیا۔

اسکی آن بان اپنی جگہ۔۔۔ مگر یہ تناؤ، یہ اداسی، یہ کرب! یہ کیا تھا سب؟

''اور خاص طور سے بیماری سے اٹھنے کے بعد تو بہت تلخ ہوگئے ہیں''۔اسکے کانوں میں دوپہر کی اسماعیل بابا کی آواز گونجی۔

اسے کیا بیماری ہوسکتی تھی؟ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

''بہت بڑا کاروبار ہے اسکا صاحبو بتا رہا تھا''۔گو پھپھو کی پیٹھ تھی اس طرف۔مگر اندازہ ضرور کرسکتی تھیں۔

وہ خاموش رہی۔

خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پھپھو میں جوگرز پہن کر آتی ہوں، پارک میں جاتے ہیں''۔

دونوں کچھ چڑھائیاں اور کچھ اترائیاں اترتیں پارک کی طرف چل دیں۔

''پھر بادل منڈلانے لگے ہیں''۔پھپھو نے آسمان پر نگاہ کی۔

''نیچے پہنچتے پہنچتے بوندا باندی بھی شروع ہو جائیگی''۔شائی بولی۔

''ہاں۔پر یہاں کے لحاظ سے موسم پھر بھی بھلا ہی ہے''۔

دونوں پارک پہنچ گئیں۔گہما گہمی تھی خوب۔چلڈرن پارک کیا تھا ملاقات کا بہانہ تھا خواتین کا۔جوق در جوق امڈ آتی تھیں۔

پھپھو تو اپنی ہمعمر دوست کو یوں ملیں جیسے مدتوں بعد دیکھا ہو۔

وہ بھی 'سی سا' پر جا بیٹھی۔جھولے پر جھولے بھی لئے۔پھر 'میری گوراؤنڈ' پر آ بیٹھی۔یہاں گول گول گھومنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

پر۔۔۔ چکر لگاتے لگاتے اسے یاد آیا سات بجے ٹی وی پر اسکا بہت فیورٹ پروگرام تھا۔وہ جلدی سے اتر آئی۔

''پھپھو چلیں۔سات ہونے کو ہیں ٹی وی پر پروگرام دیکھنا ہے''۔

پھپھو نے بڑے زور شور سے ایک واقعہ اپنی دوست کو بالکل ابھی ابھی سنانا شروع کیا تھا۔

''بیٹا تم چلو میں بس یہ بات ختم کرکے ابھی آتی ہوں''۔

''ہاں بیٹا پھپھو کو یہیں رہنے دو بڑا دلچسپ واقعہ سنانے لگی ہیں۔۔۔''۔پھپھو کی دوست نے بھی سفارش کی۔

''کوئی بات نہیں آنٹی، پھپھو یہیں رہیں میں چلی جاؤنگی۔اس پروگرام کا میں سارا ہفتہ انتظار کرتی رہتی ہوں''۔

اور پھر اس چھوٹی سی جگہ میں کسی کے گم ہو جانے کا خطرہ تھوڑی ہی تھا۔

وہ تیزی سے سڑک پر چل دی۔

تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے قدم تیز کر لئے۔

کچھ دور اور گئی تھی کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چھاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا ایک آدمی تھا۔ پہلے تو اسے لگا وہ اپنا راستہ جا رہا تھا مگر چند قدم چل کر اسے اندازہ ہوا وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

اس نے اردگرد دیکھا۔ سڑک اور آس پاس بالکل سنسان تھے۔ وہ گھبرا گئی۔ قدم اور تیز کر لئے۔ اور اسے محسوس ہوا اسی رفتار سے اس آدمی نے بھی رفتار تیز کر لی تھی۔ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ کوئی تھا بھی نہیں جس سے کچھ حوصلہ ہوتا۔

بارش اور بادلوں کی وجہ سے وقت سے پہلے دھندلکا چھا گیا تھا۔

وہ کبھی پیچھے دیکھتی اور کبھی آگے۔ رفتار پہلے سے کہیں تیز کر لی تھی۔ پچھتا رہی تھی کہ اکیلی کیوں چلی آئی۔

تبھی اسے بائیں طرف کی پہاڑی پر سے شہباز خان گھوڑے کو دوڑاتا، اترتا نظر آیا۔

وہ رک گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے کیا کہے۔ مگر جان میں جان ضرور آ گئی۔

شہباز خان کی رفتار سڑک پر آ کر دھیمی پڑ گئی۔

وہ اوپر سے ہی معاملے کی نوعیت سمجھ گیا تھا یا نیچے آ کر جان گیا تھا مگر تہہ تک ضرور پہنچ گیا تھا۔ کہ اسکے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک زوردار تھپڑ اس آدمی کے چہرے پر ایسا رسید کیا کہ وہ گھوم کر رہ گیا۔ اور پھر ــــ

اسکے کچھ سوچنے سمجھنے سے قبل ہی بازو آگے بڑھا کر اسے یوں اچک لیا جیسے وہ کوئی ہلکا پھلکا پھول تھی۔ اسے اپنے آگے گھوڑے پر بٹھایا، بازو سے سہارا دیا۔ اور لمحوں میں ہوٹل تک پہنچا دیا۔

اسکا دل تھا کہ تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا، سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں، اور ہاتھ پاؤں

جیسے حرکت کرنا بھول گئے تھے۔

اسکے دبدبے، حاکمانہ نشست و برخاست اور مقناطیسی شخصیت سے متاثر تو وہ پہلے ہی تھی۔ مگر وہ اسکے اتنے نزدیک آ جائیگا کہ وہ اسکے جسم کی گرمی، دل کی دھڑکن اور سانسوں کی مہک تک کو محسوس کر لے گی۔ یہ اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اسکے سویٹ کے آگے گھوڑا روک کر وہ نیچے اترا۔ دونوں ہاتھوں میں تھام کر آرام سے اسے نیچے اتارا۔

اسکا دل اب بھی بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا، سانسیں اب بھی قابو میں نہ تھیں۔

وہ گم سم تھی۔ 'شکریہ' تک نہ کہہ سکی کہ قوت گویائی گویا سلب ہو چکی تھی۔

اس نے ایک نظر بغور اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

پرکشش لبوں پر وہی مخصوص مبہم سی مسکراہٹ تھی اور سیاہ ساحر آنکھیں اسکی دلآویز مسکراہٹ کا مکمل ساتھ دے رہی تھیں۔

گھبرا کر وہ پلکیں جھپکنے لگی اور وہ ــــ

گھوڑا وہیں چھوڑ ــــ اپنے سویٹ کی طرف بڑھا۔

سائیس آ کر گھوڑا لے جانے لگا تو اسے ہوش آیا۔ اور وہ اپنے حواس سمیٹتی سنبھالتی اندر سویٹ میں آ گئی۔

گیلے کپڑے تبدیل کئے، ٹی وی آن کیا، پروگرام دیکھنے لگی۔ مگر اب ــــ

اسکی کچھ دیر قبل والی وہ بے تابی باقی نہ رہی تھی۔ بار بار چونک اٹھتی۔ اسکی بھرپور شخصیت اس کے حواسوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

پھپھو آئیں۔ رات کھانے پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر وہ 'ہوں' 'ہاں' میں ہی جواب دیتی رہی۔ وہ جیسے لوہے کا ایک ٹکڑا تھی اور مقناطیس کی طرف کھنچ جانے پر مجبور!

اس نے یہ واقعہ پھپھو کو بھی نہیں بتایا۔ کچھ اسے جھجک سی تھی شہباز خان کی وجہ سے کچھ وہ خواہ مخواہ فکرمند بھی ہو جاتیں۔

رات وہ بار بار کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند کوسوں دور تھی، اسکے خیالوں پر وہی اور وہی چھایا ہوا تھا۔

بے حد عجیب، انوکھی اور انجانی سی کیفیت تھی۔ معصوم سی شائی کا ننھا سا دل سترہ سالوں میں پہلی بار بے قرار ہوا تھا، مچل گیا تھا، ضد کرنے لگا تھا!

اس وقت اسے احساس ہوا امپریس تو وہ پہلی بار اسے دیکھتے ہی ہوگئی تھی، پسند تو وہ اسے دوسری تیسری بار دیکھتے ہی کرنے لگی تھی مگر ——

وہ اسے بہت ہی اچھا لگنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ پاگل دل اسے پالینے کی خواہش کرنے لگا تھا یہ اسے اس وقت معلوم ہوا۔

صبح اسکی آنکھ دیر سے کھلی۔ پہلا خیال اسے شہباز خان کا آیا۔ ساتھ ہی دل دھڑک اٹھا۔ کیا وہ اس بری طرح اس کے حواسوں پر چھا گیا تھا۔ کوشش کر کے اس نے خیال جھٹکا اور اٹھ کر باتھ روم چل دی۔

منہ ہاتھ دھو کر اس نے سی گرین گرم کپڑے پہنے، سفید موہیر کا سویٹر اور سی گرین جیکٹ کیساتھ ہمرنگ شوز پہنے۔ گھنے سیاہ بالوں میں برش کرتے ہوئے وہ ناشتے کیلئے آنے لگی۔

ایک چور سی نظر اپنے بیڈروم کی کھڑکی پر ڈالی۔

وہ وہیں تھا اپنے برآمدے میں، کل کی طرح اسی کرسی پر سر پشت سے ٹکائے، ٹانگیں سامنے سیدھی پھیلائے، دلکش انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے اپنے ارد گرد منڈلاتے بادلوں کو جیسے اپنے من میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ یقیناً ہائیکنگ اور پھر ٹھیک نو بجے ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ وقت کا بہت پابند تھا۔ صبح ہی صبح ہائیکنگ، نو بجے ناشتہ، گیارہ بجے نیچے ریسٹورانٹ میں کوفی، ٹھیک دو بجے لنچ، شام پانچ بجے رائیڈنگ اور رات نو بجے ڈنر —— ضرور رات بستر میں جانے کا بھی وقت مقرر تھا!

وہ اُسے اس وقت بہت اچھا لگا —— جیسے زمانوں سے جانتی تھی اسے، جیسے بالکل بھی اجنبی نہیں تھا، جیسے اپنا تھا بالکل!

اس نے لونگ روم میں سے دیکھا۔ پھپھو برآمدے میں بیٹھیں اخبار پڑھنے میں مشغول تھیں۔ وہ چند ہی جماعت پڑھی تھیں مگر اخبار میں اپنے مطلب کی خبریں بخوبی پڑھ لیتی تھیں۔ ساتھ ہی ہاتھ میں تسبیح بھی تھی۔ پھپھو یہ دو کام اکثر اکٹھے کرلیا کرتی تھیں، جانے

کیسے؟ وہ مسکرادی۔

''بیٹے میں نے ناشتہ کرلیا ہے۔ صاحبو سے کہو تمہارے لئے تیار کرے''۔ وہ آہٹ پر سمجھ گئیں وہ جاگ چکی ہے۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دے ڈالی۔

''اچھا پھپھو''۔ اور وہ کچن میں آگئی۔

وہیں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ سویپر اندر کمروں میں صفائی کر رہا تھا، وہ باہر برآمدے میں آکر پھپھو کے پاس بیٹھ گئی۔

''آج شام ٹیلی فون ایکس چینج میں جائینگے۔ اپنے پاپا سے بات کرلو، ضروری ہے''۔

''لائین مل بھی جائے نا''۔

''امید تو ہے، کوشش تو کر رہے ہیں ایکس چینج والے لائین ٹھیک کرنے کی''۔

''مجھے خود بھی پاپا بہت یاد آرہے ہیں''۔

پاپا اسکے پاپا بھی تھے مگر ایک بہت بے تکلف دوست بھی۔ بڑی گپ شپ چلتی تھی آپس میں دونوں کی، اور پھر وہ ـــــ اسے بے اندازہ چاہتے بھی تھے۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی انہوں نے اسے ڈانٹا ہو، یا اسکی مرضی کے خلاف کچھ کیا ہو یا پھر ـــــ اسکی کوئی خواہش پوری نہ کی ہو!

''اللہ بھائی صاحب کو زندگی دے۔ انہی کے دم قدم سے تو ہے سب کچھ''۔ پھپھو اکثر صلاح الدین صاحب کا اور خاص طور سے اسکی ممی کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتیں۔

وہ خاموش تھی۔

''سچ پوچھو تو اب تمہاری بھی فکر لگی رہتی ہے''۔ پھپھو پھر بولیں۔

چونکتے ہوئے اس نے پھپھو کی طرف دیکھا۔

کہیں وہ اسکے دل کا چور بھانپ تو نہیں گئی تھیں!

''میری فکر؟'' جیسے وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

''ہاں بیٹا۔ جب سے تو ذرا بڑی ہوئی ہے، میری ذمہ داری کہیں بڑھ گئی ہے۔ چھوٹی سی

تھی تو ساتھ چمٹائے رکھتی تھی تب اتنی فکر نہ تھی''۔

''اب کیا ہوگیا''۔ وہ مسکرائی۔ پھپھو لاعلم لگتی تھیں۔

''کچھ نہیں۔ بس سوچتی ہوں تیرے ہاتھ پیلے کردوں تو چین کی نیند سوسکوں''۔

''چھوڑیں پھپھو''۔ اسے عجیب سا لگا۔ ''ابھی تو میں نے پڑھنا ہے، کافی وقت پڑا ہے ان باتوں کیلئے''۔

''نہیں بیٹا۔ لڑکی جب جوان ہو جاتی ہے تو ماں باپ کے کندھوں پر بڑا بوجھ آپڑتا ہے۔ تم ابھی کمسن ہو، نہیں سمجھ سکتیں۔ مگر میں تو سمجھتی ہوں۔ مجھ پر اور بھائی صاحب پر تو ذمہ داری ہے۔ اچھا رشتہ آئے گا تو ضرور سوچیں گے''۔

شائی کو شہباز خان کا خیال آیا۔ اسے وہ بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ مگر شادی؟ اس کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''ابھی ڈھائی تین مہینے پہلے تمہارے رشتے کے بارے میں بات کرنے کوئی خاتون آئی تھیں۔ اس دن میں صفیہ کی بیمار پرسی کیلئے گئی تھی''۔ انہوں نے اپنی رشتے کی چچازاد بہن کا کہا۔ ''میں مل نہیں سکی ان خاتون سے۔ تمہارے پاپا نے تمہاری پڑھائی کا کہہ کر منع کردیا۔ کہتے تھے بہت خاندانی اور سرمایہ دار لوگ تھے مگر وہ اس قدر جلد تمہیں اپنے سے الگ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسلئے انہیں انکار کردیا۔ میں موجود ہوتی تو بھائی صاحب کو سمجھاتی۔ اچھے رشتے لوٹانے نہیں چاہئیں''۔

وہ چپ تھی، کہتی بھی کیا۔ پھپھو پہلے بھی کبھی کبھی بقول انکے اسکے ہاتھ پیلے کرنے کے بارے میں کہتیں مگر اتنی سیریس کبھی نہیں تھیں۔ آج کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لگ رہی تھیں۔

سویٹ صاف ہوگیا تو وہ دونوں اندر آگئیں۔

پھپھو کچن میں صاحبو کو دوپہر کے کھانے کی ہدایات دینے لگیں اور شائی نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے ایک نئی کتاب پڑھنے کیلئے الماری سے نکال لی۔

آج تو اسکا من کتاب میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کیا ہوگیا تھا اسے؟ یوں کسی اجنبی کے

بارے میں سوچنا اور پھر سوچتے چلے جانا! یہ کیسی کیفیت تھی!

گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے کتاب بند کی۔ سوچا نیچے جا کر آئس کریم کھا لے، کل بھی نہیں کھا پائی تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ بارش کی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

پھپھو وہیں بیٹھیں گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتیں حسب معمول صاحبو کاکا سے موجودہ وزیر اعظم کی نااہلی کا رونا رو رہی تھیں۔

''پھپھو نیچے چلتے ہیں آئس کریم کھائیں گے''۔

''اے بیٹا ہوش کی دوا کرو۔ میرے منہ میں گرم گرم چائے کے گھونٹ، اس قدر سردی اوپر سے بارش۔ میں آئس کریم کھاؤں گی...''۔

وہ جز بز سی ہوئی۔

''تو؟''

''تم جاؤ ہاں چھتری لے کر جانا۔ بارش میں مت بھیگنا سمجھیں''۔

''اچھا پھپھو''۔

اور خوبصورت سی پھولدار چھتری سر پر لے کر وہ تتلی کی طرح اڑتی نیچے جا پہنچی۔

ریسٹورانٹ کے دروازے پر اس نے چھتری بند کر لی۔ بھاری سا دروازہ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ کاؤنٹر پر آئس کریم کا آرڈر دیا۔ وہ کئی سالوں سے انکی مستقل گاہک تھی، بہت خیال رکھتے تھے وہ اسکا۔

وہ سیدھی اپنی جگہ پر آ گئی کہ وہاں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔

اپنے خوبصورت ماتھے پر گھر آئی بالوں کی موٹی سی لٹ پیچھے ہٹاتے ہوئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسکی نظر سامنے کونے والی میز کی طرف اٹھی۔

وہ موجود تھا وہاں۔ کہ وہ وقت کا بہت پابند تھا اور حقیقتاً بہت ڈسپلنڈ زندگی گزار رہا تھا!

وہ شاید کافی دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی دلآویز موہوم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے، وہی

جیٹ بلیک کچھ بولتی آنکھوں کا جادو جگائے، وہی مقناطیسی کمانڈنگ شخصیت لئے!

آس پاس کی فضا اسکے قیمتی سگریٹ اور مخصوص پرفیوم کی آپس میں مدغم ہوتی مدھر اروما سے مہک رہی تھی۔

اسکی جادوئی شخصیت اور سحر انگیز نظروں کا تاب نہ لاتے ہوئے اسکی لمبی لمبی سیاہ جھالریں پلکیں جھک گئیں، سرخ ہوتا چہرہ تپنے لگا۔ نازک ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

جانے کب آئس کریم آئی، کیسے اس نے ختم کی اور کسطرح وہ ریسٹورانٹ سے باہر نکلی۔ تیر کی طرح تیز وہ سیدھی اپنے سویٹ پر آ گئی۔

یہ کیسا تجربہ تھا؟ انوکھا، نرالا!

وہ اسے بہت اچھا لگتا تھا مگر ــــ وہ اس سے اس قدر گھبراتی، شرماتی کیوں تھی؟

دوپہر کھانے کے بعد وہ سیدھی بستر پر گئی۔ آج ناول بھی دوبارہ نہیں پڑھا۔ وہ تو اسے ہی سوچنا چاہتی تھی، اسے تصور میں لانا چاہتی تھی، اسی کی ہی شبیہہ دیکھنا چاہتی تھی اور بس!

اور پھر ــــ یوں ہی نے لگا۔

صبح آنکھ کھلتے ہی پ خیال اسے شہباز خان کا آتا۔ جیسے پلکوں پر ہی رہنے لگا تھا کہ کھلیں اور اتر کر آنکھوں میں در آیا۔

وہ اپنے بائیں کھڑکی میں سے اسے تلاش کرتی بستر سے اٹھتی، باتھ روم جاتی، تیار ہوتی، واپس کمرے میں آتے ہوئے ایک بار پھر چوری نظر کھڑکی پر ڈالتی۔

وہ تو جیسے خود سے چھپانے لگی تھی۔ اپنے من کا چور!

وہ اسے روزانہ اسکے برآمدے میں ناشتہ کرتے دیکھتی، وہ ریسٹورانٹ میں کوفی پینے جاتا تو مچلتا دل اسے کشاں کشاں وہیں لے چلتا ــــ بلکہ اب تو اسے لگتا تھا وہ صرف اور صرف اسی کیلئے ریسٹورانٹ جاتی تھی۔

دوپہر لنچ کیلئے سویٹ سے نکلتا تو وہی کہیں نہ کہیں سے اسے ضرور دیکھ لیتی، کبھی اپنی

کھڑکی سے، کبھی اپنے برآمدے سے۔ بلکہ ـــــ کیا ایسا نہیں تھا کہ وہ دو بجے کی منتظر رہتی تھی اور اسے تاکتی رہتی تھی؟

یہی حال اسکی باقی مصروفیات پر نظر رکھنے کا تھا۔

اس نے اسے رائیڈنگ پر روانہ ہوتے وقت کبھی مس نہیں کیا تھا۔

شام کو پارک وہ پہلے بھی جایا کرتی تھی مگر اب لگتا تھا وہ اسے ہی رائیڈنگ سے واپسی پر دیکھنا چاہتی تھی۔

اور پھر رات نو بجے بھی اسکی ڈنر پر روانگی کے وقت کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اپنے کمرے کی بتی بجھا کر اسنے اسے دیکھا نہ ہو!

آج وہ اور پھپھو، شاکر کیساتھ چند میل پر واقع پہاڑی شہر گئی تھیں۔ پھپھو کی دوائی یہاں نہیں ملتی تھی وہ لانی تھی اور کچھ ضروری چیزیں اور تھیں جو خریدنا تھیں۔ بہر حال وہ وہاں کافی دیر پیدل پھرتی رہی تھیں۔ واپس پہنچیں تو سخت تھکی ہوئی تھیں۔ وہ تو کھانا کھاتے ہی بستر میں گھس گئی۔

جانے کس وقت اسکی آنکھ لگی، جاگی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس کی پہلی نظر حسب معمول بائیں طرف اپنی کھڑکی سے ہوتی اسکے سویٹ پر پڑی اور ـــــ اسے پہلا خیال آیا وہ رائیڈنگ پر جا چکا ہوگا۔

وہ گھبرا سی گئی۔ اسکے تو ذہن و دل اسکے ہو گئے تھے۔ وہ تو خود اپنی نہ رہی تھی!

باتھ روم جا کر وہ نہائی۔ ڈریسنگ روم آ کر اس نے سکارلٹ ریڈ گرم کپڑے پہنے۔ گرے ڈھیلا ڈھالا نرم و گرم سویٹر پہنا، گرے لیدر کے شوز اور ہمرنگ دوپٹہ لیا، کپڑوں پر اپنی پسندیدہ کلون سپرے کرتی وہ برآمدے میں آ گئی۔ پھپھو وہاں نہیں تھیں۔ اندر آ کر کچن میں دیکھا، وہاں بھی نہیں تھیں، کچن کے پچھواڑے سے البتہ ان کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ وہیں چلی آئی۔ دیکھا پھپھو سے ملنے انکی وہی ہمعمر دوست آئی تھیں جو اکثر انہیں پارک میں ملا کرتی تھیں۔ گرم گرم پکوڑوں کیساتھ چائے پیتیں دونوں باتوں میں مشغول تھیں۔

'سلام' کرتے ہوئے وہ بھی پاس چلی آئی۔

اسکا خیال تھا پھپھو کو ساتھ لیکر پارک جائیگی۔

مگر اب انکی مہمان کی موجودگی میں ایسا کرنا اسے مناسب نہ لگا۔

تھوڑی دیر وہ انکے پاس وہیں بیٹھی رہی۔

پھپھو آپ لوگ گپ شپ کریں میں نیچے پارک جاتی ہوں۔ ٹیلیفون ایکسچینج بھی چلی جاؤنگی...

"ہاں۔ یہ بہت ضروری ہے"۔ وہ اسکی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ کئی دنوں سے صلاح الدین صاحب سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ "پر شام ہونے سے پہلے آجانا بیٹا"۔

"او کے پھپھو"۔

وہ وہیں سے قلانچیں بھرتی چل پڑی۔

یہاں آسمان جگہ جگہ سے صاف تھا، نیچے بازار اور پارک بادلوں کی چھاؤں میں تھے۔ لمبی لمبی سرسراتی گھاس میں سر اٹھائے ان گنت سفید سنگریزوں سے بچتی بچاتی، اونچی نیچی گھاٹیوں پر سے ہوتی وہ شارٹ کٹ کرتی سیدھی پارک پہنچ گئی۔

خاصی دیر وہیں رہی۔ 'میری گوراؤنڈ' آج کسی ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے بند تھا۔ وہ جھولے پر ہی جھولے لیتی رہی۔ پھر قدرے فاصلے پر واقع ٹیلیفون ایکسچینج چلی گئی۔

قسمت یاور ہوئی، جلدی ہی لائین مل گئی اور دونوں بہنوں نے پاپا سے بات کی۔

خوشی خوشی واپس لوٹی۔

اوپر نیچے، بل کھاتی سڑک پر چلتی گئی۔

یہاں دھوپ ڈھل چکی تھی، کہرا گھر آیا تھا، شام دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ اوپر اس پار انکے ہوٹیل پر شام شرما کر گلابی ہو رہی تھی۔

وہ اپنی ہی رو میں چلی جا رہی تھی۔ کہ اچانک ایک خودرو جھاڑی کے کانٹوں میں اسکا پاؤں الجھ گیا۔

تبھی بیٹھ کر وہ اپنے پائینچے سے کانٹے الگ کرنے لگی۔

تبھی دیکھا اسکے ٹخنے پر زخم آیا تھا۔ اسکے پاس کوئی چیز بھی نہیں تھی جس سے صاف کرتی یا باندھ ہی لیتی۔

بہر حال وہ آگے بڑھی۔ چند قدم چلی ہی تھی کہ احساس ہوا زخم بھیگ رہا تھا۔ وہ دوبارہ وہیں سڑک کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ پائینچا ہٹا کر دیکھا، واقعی خون کی پتلی سی لکیر بہتی اسکے جوتے کو بھگو رہی تھی۔ اسے اور کچھ نہ سوجھا تو قریب سے گھاس توڑ کر جوتا صاف کرنے لگی۔

تبھی وہ آہٹ پر چونکی — نظریں اوپر اٹھائیں۔

شہباز خان تھا گھوڑے پر سوار اسکے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ سفید بے داغ شرٹ اور بیج کلر پینٹ میں وہ بے حد سمارٹ لگ رہا تھا۔ بازوؤں اور سینے کے ابھرے ہوئے مسلز قمیض کے اندر سے بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ کس قدر مکمل بنایا تھا خالق نے اسے!

وہ جلدی سے گھوڑے سے اترا، دوزانو ہو کر اسکے پاس بیٹھا، جیب سے رومال نکالا اور — بغیر کچھ کہے سنے اسکے زخم پر باندھنے لگا۔

وہ بھی گم سم چپ چاپ اپنے پاؤں پر نظریں جمائے بیٹھی رہی کہ — اس نے ہار مان لی تھی وہ اسکے سامنے بول نہ پاتی تھی، بت بن جاتی تھی۔

رومال باندھ کر وہ چند ثانیے یوں ہی بیٹھا اسے تکتا رہا۔

اس نے جھکی جھکی سیاہ خمیدہ پلکیں اٹھا کر بمشکل اس کی طرف دیکھا۔ زخم کی وجہ سے اسکی حسین کھوجتی آنکھوں میں تکلیف اتر آئی تھی۔

دو پل وہ اسکی آنکھوں میں بغور دیکھتا رہا۔ اسکی نظروں میں ملائمت تھی، یگانگت تھی، تشویش تھی۔

پھر — اس نے تسلی دینے کے انداز میں اپنائیت سے اسکا گال تھپتھپایا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسکی نظریں اب بھی شانی پر تھیں۔ شانی بھی اسی کی طرف متوجہ تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ ہولے سے۔

پھر — اپنا مضبوط ہاتھ اسکی طرف بڑھایا۔

بلا چوں وچرا اس نے اپنا نازک ہاتھ اسکے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ کھڑی ہوگئی تو اس نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر قریب کھڑے گھوڑے پر بٹھایا۔ خود بھی اسکے پیچھے بیٹھا اور آج ایک بار پھر اسے ہوٹیل کی جانب لے چلا۔

جانے کیا بات تھی؟

اس وقت کا اسکا انداز پچھلی بار سے مختلف تھا۔ اس نے پہلے بھی اسے بازو کے حلقے میں لے رکھا تھا مگر آج اسے سختی سے اپنے سینے سے جکڑ رکھا تھا، پہلے بھی شانی نے اسکے دل کی دھڑکن اور مہکتی سانسیں محسوس کی تھیں مگر آج اسکے دل کی دھڑکن بے ترتیب اور مہکتی سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ پچھلی بار بھی اسکے بالوں کی لٹیں اڑ اڑ کر اسکے چہرے کو چھو رہی تھیں مگر اس وقت اس نے محسوس کیا وہ بھی اپنا چہرہ اسکے بالوں میں سموئے دے رہا تھا۔

وہ مسحور تھی، بے خود تھی، نشہ طاری تھا اس پر۔ کب اور کیسے وہ سویٹ تک پہنچی اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

حواسوں میں آئی تو اس وقت جب وہ گم سم اپنے بیڈروم میں کھڑی تھی اور پھپھو نے اندر داخل ہو کر لائیٹ آن کی تھی۔

''بھائی صاحب سے بات ہوئی؟'' چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا۔

''آں ــــ ہاں پھپھو۔ آج تو فوراً لائین مل گئی۔'' اس نے خود کو سنبھالا۔

''معجزہ ہو گیا یہ تو۔'' وہ پردے برابر کرتے ہوئے بولیں۔

''بالکل معجزہ۔ آپریٹر کہہ رہا تھا بالکل ابھی ابھی لائین ٹھیک ہوئی ہے''۔ اسکی آواز میں خوشی کی چہکار تھی۔

''کیسے تھے بھائی صاحب۔ آنے کا کہا تم نے''۔

''کہا۔ مگر وہی... فرصت نہیں مل سکتی''۔

''چلو اچھا ہوا بات تو ہوگئی تمہاری۔ خوش ہو گئے ہونگے''۔ وہ اسکے بستر میں پاؤں کی ف بیٹھتیں پاؤں کمبلوں میں گھساتے ہوئے بولیں۔

ت۔ ۔پکا پوچھ رہے تھے۔ اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کمرے [illegible] دوائی لیں جب

ختم ہو تو بند کر دیں''۔ وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

اس نے رات کے ڈھیلے ڈھالے نرم گرم کپڑے پہنے۔ شوز اتار کر چپل پہنی اور ــــ رومال وہیں زخم پر رہنے دیا کہ وہ اسے اتنی جلدی اپنے سے الگ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ٹخنہ پائینچے میں اچھی طرح چھپاتی وہ کمرے میں آ گئی۔

اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات پھپھو کو بتانیوالی شانی آج پھپھو سے اتنی بڑی بات چھپا رہی تھی ــــ دل میں چور جو چھپا بیٹھا تھا۔

دونوں نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ دنوں بعد پھپھو سے خوب خوب باتیں ہوئیں۔ پھپھو کا خیال تھا یہ خوشی یہ اطمینان باپ سے بات ہو جانے کی وجہ سے تھا مگر ــــ

یہ نہ سمجھ پائیں کہ یہ جھکی جھکی نظریں، کھلا کھلا چہرہ، کسی کے پیار میں مبتلا ہونے کی علامت تھے۔

بتی بند کرتے ہوئے پھپھو اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں۔

اس نے بھی سونے کی کوشش کی مگر ــــ

کیسے سوتی کہ اسکا جسم اب بھی اسکا لمس محسوس کر رہا تھا، اسکی مہکتی بے قابو سانسیں اسکی سانسوں میں مدغم ہو رہی تھیں اور اپنے بالوں میں وہ اب بھی اسکا چہرہ چھپتا محسوس کر رہی تھی!

کیسے نیند آتی کہ اسکی مخصوص پرفیوم کی خوشبو جو اسے دور سے پاگل کئے دیتی تھی آج خود اسکے جسم پر منتقل ہو گئی تھی!

کیسے آنکھ بند کرتی کہ حواس تو سارے کے سارے اس کے تابع ہو گئے تھے!

رات سیاہ تھی، سناٹا تھا ہر طرف، سردی بلا کی تھی۔

اوورکوٹ کے کالر اوپر چڑھائے، اپنے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے وہ سگریٹ پر سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

دھر لیا تھا اس نے ے۔ وہ تلخی سے مسکرایا۔

اس نے اسے گا ن تھی ـــ وہ مانتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی ایک ناجائز اولاد تھا۔

ایک دنیا اسے لعنت، ت کرتی ہوگی، مذاق اڑاتی ہوگی، حرام کی اولاد سمجھتی ہوگی مگر ـــ

اسے براہ راست ی نے کبھی ذلیل نہیں کیا تھا۔

کچھ لوگ اس ہمدردی بھی رکھتے ہونگے، قابل رحم بھی سمجھتے ہونگے، ترس بھی کھاتے ہونگے کہ۔

یہ سب اسکے مقد میں لکھا تھا مگر ـــ

یوں بے عزت کر کے اسے کسی نے نہیں دھتکارا تھا۔ وہ تو ـــ اسے تو۔

ہمیشہ بہت محبت، بڑی قدر اور بے حد عزت ملی تھی۔ یہ شاید اسکی اپنی عادتوں، اپنے اخلاق اور اپنے اطوار کی وجہ سے تھا۔

بہت اچھے دوست ملے تھے، شفقت کرنیوالے بزرگ ملے تھے، قدر کرنیوالے سٹاف ملے تھے۔

مگر ـــ جب سے اس نے اسے دھتکارا تھا۔ اسکا اپنے اوپر سارا اعتماد چکنا چور ہو گیا تھا، لوگ اپنا مذاق اڑاتے نظر آنے لگے تھے۔ ہمدردیاں، محبت و عزت ڈھونگ لگنے لگے تھے۔ وہ مکمل طور پر بکھر گیا تھا۔

اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ کہ وہ اپنا اور مذاق اڑتا نہیں دیکھ سکتا تھا، اور ترس و ہمدردیاں نہیں سہہ سکتا تھا ـــ اور ان پارساؤں کی دنیا کو فیس نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ـــ

ڈاکٹروں نے اسے بچا لیا۔ نانو کے واسطوں سے وہ پل گیا، اسماعیل بابا کے آنسوؤں نے اسے پگھلا دیا اور اپنے جگری دوست کی التجاؤں نے اسے روک لیا۔

دو دن دو رات وہ انٹینسیو کیئر میں رہا۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں رہا۔ گو اس نے اپنے مرنے کی بارہا دعائیں مانگی تھیں مگر ـــ

خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ نانو کے اللہ کے حضور نالے عرش کو ہلا گئے، اسماعیل بابا کے جھریوں بھرے چہرے پر بہتے آنسو اور التجائیں قبول ہوئیں، اسکے محبت کرنیوالے دوست فاروق کی دعائیں رنگ لائیں اور وہ ـــ بچ گیا۔

پورے دو ماہ ہوسپٹل میں گزارے۔ ڈاکٹروں کی اسکی جان بچانے کیلئے اس قدر سر توڑ کوششیں دیکھ کر، نرسوں کو اپنی اس قدر خلوص سے خدمت کرتے دیکھ کر اور اپنے سٹاف کو اپنے لئے اس قدر پریشان اور دعا گو دیکھ کر ـــ اس میں ایک نئی ہمت، نیا حوصلہ اور نیا ولولہ جاگا!

اس نے دیکھ لیا کہ ایک ناجائز اولاد کی زندگی بچانے کیلئے بھی کوششیں کی جاتی ہیں، اسکی جان کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے، وہ بھی اس دنیا میں زندہ رہنے کا مستحق ہوتا ہے۔

وہ بھی اہم ہوتا ہے، اسکی جان کی بھی وقعت ہوتی ہے، اسکی زندگی بھی مول رکھتی ہے۔

بالکل اتنی ہی جتنی حلال کی اولاد کی ہوتی ہے!

تبھی ـــ اس نے حالات سے لڑنا سیکھ لیا، دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ لیا ـــ اور زندہ رہنا گوارا کیا!

وہ جیسے نیا جنم لے کر ہوسپٹل سے باہر آیا۔ پراعتماد، مستحکم اور بے باک ـــ بالکل اپنے نام کی طرح!

پر ـــ ایک بات بہت نئی تھی۔ اسکی شخصیت کے بالکل منافی۔ اور جس پر اسے قابو نہیں رہا تھا!

وہ بہت تلخ ہوگیا تھا!

بات بے بات بگڑ جاتا، فوراً غصہ آجاتا، اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پاتا۔

اِس لڑکی کو اپنے دام میں پھنسانے کیلئے اس نے جو نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا اس پر اسے پہروں حیرت ہوتی۔

مگر ___ اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر، پھر اچھی طرح رلا کر، پھر اسے یہ بتا کر کہ اس نے اسے 'حرام کی اولاد' کہہ کر اسے گالی دی تھی، اسے بیچ منجدھار تڑپتے چھوڑ جانا اس کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا اور آج ___

ایک بار پھر وہ تلخی سے مسکرایا۔

وہ اپنے مقصد کے پہلے مرحلے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ ڈور کٹی پتنگ کی طرح اسکی جانب بڑھ آئی تھی!

اس نے اپنی ریڈیم گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج رہے تھے۔ وہ تھکا تھکا سا اندر کمرے میں آ گیا۔

رات کے کپڑے تبدیل کئے، بستر میں لیٹا، سرہانے رکھا لیمپ آف کیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ___ نیند کہاں؟

دنیا میں اگر کوئی اسکا اپنا تھا تو وہ نانو تھیں۔ انکی اس میں جان تھی۔ پانچ سال کا پورا ہوتے ہی وہ اسے اور اسماعیل بابا کو لیکر سوئیٹزرلینڈ چلی گئیں۔ وہاں سکول میں اسکا داخلہ کرایا اور رہنے کیلئے ایک فلیٹ لیکر انہوں نے اسے خدا اور اسماعیل کے بابا کے حوالے وہاں چھوڑ دیا۔

وہ بڑھتا رہا۔ ہر سال چھٹیوں میں نانو آکر دو ڈھائی ماہ اسکے ساتھ گزار کر واپس چلی جاتیں ___ اور یوں وہ پلتا اور بڑا ہوتا گیا۔

گریجویشن کر کے اس نے نانو سے وطن آنے کو کہا مگر انہوں نے امریکہ سے ایم کام کرنے کا کہہ دیا۔ پاس ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر نانو سے وطن آنے کی ضد کی مگر نانو اس بار بھی ٹال گئیں۔ وہیں جاب کر لینے کو کہہ دیا۔ اس نے جاب بھی شروع کر دی۔ حسب

معمول نانو آکر مل لیتی تھیں مگر اسے کبھی وطن آنے کا نہ کہتیں۔

پھر ہفتے، مہینے گزرتے رہے۔ پچھلے تین سال سے نانو ملنے نہیں آسکی تھیں کہ بقول انکے اب وہ بوڑھی ہوگئی تھیں۔ گاؤٹ کے درد نے آلیا تھا۔

اسے اکثر خیال آتا بقول اسماعیل بابا انکا بہت بڑا کاروبار تھا۔ کئی کئی انڈسٹریز تھیں جو مینیجرز کے حوالے تھیں اور نانو جن کی مینیجنگ ڈائریکٹر تھیں۔ کیا وہ وطن آکر نانو کا ہاتھ نہیں بٹا سکتا تھا۔ مگر ___

نانو تھیں کہ ایک بار فون پر کہنے لگیں۔ 'شاہ جان' وہ پیار سے اسے 'شاہ جان' کہتیں۔ 'وہیں کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لو'۔

'نانو۔ نانیاں تو کہتی ہیں کچھ بھی کرو مگر شادی کسی غیر ملک کی لڑکی سے مت کرو۔ اور پھر میں تو آپکی جان ہوں...' اس نے جواب دیا تھا۔

کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ وہیں ایک ڈنر میں اس نے شائی کو دیکھا۔ اسکا بے مثال حسن اور فرشتوں کی سی معصومیت اسے اپنا گرویدہ بنا گئی۔ اس نے اسے کافی قریب سے دیکھا تھا۔ سرخ سفید بے داغ رنگت پر بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں۔ وہ بھی ایسی کہ جیسے آسمانی رنگ پر ہلکا گلابی رنگ ڈال دیا گیا ہو۔ پرپلش ___ پہلی بار اس نے آنکھوں کا ایسا رنگ دیکھا تھا۔ اسکا نِک نیم شائی تک اسے بہت اچھا لگا تھا۔

اس نے اسکا پتہ لگایا۔ وہ پاکستان میں ایک سرجن کی بیٹی تھی۔

اسے زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی شادی کیلئے پسند آئی تھی۔

اس نے فوراً نانو کو فون کیا۔ شائی کا اتہ پتہ بتایا اور زور دیا کہ وہیں اس کیلئے بات کی جائے اور ساتھ ہی ___

نانو کو مژدہ سنایا کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ اگلے ہفتے وطن آرہا ہے۔ کہ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ نانو اور بزنس کیلئے اسکا وطن میں رہنا زیادہ ضروری تھا۔

اب نانو کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جس بات پر شاہ جان

اڑ گیا بس اڑ گیا اور ـــــ

اسی وجہ سے انہوں نے ماما خوش بخت کو شائستہ کے یہاں سُن گُن لینے بھیج دیا تھا۔

شہباز خان اگلے اتوار کو واقعی وطن پہنچ گیا۔ خوش تھا بہت کہ نانو اسکی ناز برداریوں میں مصروف تھیں، محبت وشفقت کے خزانے لٹا رہی تھیں، اور گھر، گھر سے باہر سبھی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

اسکا اخلاق، اسکا نرم رویہ اور مزاج کی انکساری انہیں اسکا گرویدہ کئے دے رہے تھے۔

جہاں اسکی چال ڈھال میں آن بان تھی، شخصیت میں دبدبہ تھا وہاں وہ ـــــ

بہت نرم دل کا بھی تھا، بہت غریب پرور بھی تھا!

اس نے نانو سے ایک بار پھر شادی کی بات چھیڑی۔ انہوں نے اسکی تسلی کر دی۔ کہ انہوں نے خوش بخت کو بھیجا ہوا ہے۔ وہ چند دن اپنے گاؤں میں رہ کر بس آج ہی کل میں آتی ہو گی۔

وہ آفس سے تھکا تھکایا گھر پہنچا۔ اپنے بیڈروم میں جا کر کپڑے تبدیل کئے۔ اور پھر نانو کی طرف آنے لگا۔

'لڑکی کی ماں نہیں ہے۔ بس باپ ہی ہے۔ بہت شریف انسان ہیں، بولے۔ 'شہباز گروپ آف انڈسٹریز کے مالک کو کون نہیں جانتا، نامی گرامی لوگ ہیں آپ۔ بیگم صاحبہ سے کہنا ہم انکی بہت عزت کرتے ہیں مگر شائستہ ابھی بہت چھوٹی ہے اور اس نے ابھی تعلیم بھی مکمل کرنی ہے'۔ میری بہت خاطر تواضع بھی کی، بہت عزت دی ـــــ بیٹی بھی وہیں تھی۔ وہ تو بات کر کے اوپر کمرے میں چلے گئے۔ اور میں نے اجازت لی۔ انکی بیٹی مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی تو بولی۔

'ہم حرام کی اولاد کو بیٹی نہیں دیتے، ہمارا دستور نہیں ہے...'

چند لمحے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکا۔ پر سر گھومنے لگا، جسم کی سکت جاتی رہی تو ـــــ لڑکھڑاتے قدم بمشکل سنبھالتا وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ـــــ تو دیکھا نانو اسکے بستر پر بیٹھیں اسکا سر اپنی گود میں رکھے تھیں۔

اور آنسوؤں کی جھڑی تھی کہ اسکا سر بھگوئے دے رہی تھی۔

'نانو' ـــــ وہ ان سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

نانو بھی عرصہ بعد چیخ چیخ کر رو دیں کہ انہیں بھی یہ بوجھ سنبھالے زمانہ بیت گیا تھا۔

کئی ثانیے یوں ہی گزر گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔ پھر نانو گویا ہوئیں۔

'نغمانہ کی دوست فریدہ کا ایک دن اچانک گاؤں فون آ گیا'۔ نغمانہ انکی بیٹی، شہباز خان کی ماں تھی اور فریدہ اسکی دوست، دونوں شہر میں ہوسٹل میں پڑھتی تھیں۔ 'آنٹی فوراً پہنچیں نغمانہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے'۔

اس نے مجھے جو جگہ اور کلینک بتائے وہ انکے ہوسٹل سے خاصے دور دراز علاقے میں واقع تھے۔ تمہارے نانا اُس وقت یہاں آفس میں تھے، آتے جاتے تھے گاؤں سے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اکیلی چل پڑی۔ دل میں سو اندیشے لئے وہاں پہنچی تو معلوم ہوا نغمانہ تمہیں جنم دے کر انتقال کر گئی تھی۔

فریدہ اور اسکی ماں تم دونوں کے پاس تھیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ بیٹی کو روؤں یا تمہارے لئے سر پیٹوں۔

''آنٹی۔ نغمانہ کا پچھلے ایک سال سے ایک لڑکے امجد کیساتھ افیئر تھا۔ پھر وہ پریگننٹ ہو گئی۔ میں نے اسے امجد سے بات کرنے کو کہا تو وہ بولی وہ کبھی کا شہر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اسکے علاوہ نہ کچھ بولتی تھی نہ بتاتی تھی۔ بس گم سم رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد میں نے امی سے بات کی۔ اور امی آپکا اور انکل کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے اسے ڈیلیوری کیلئے یہاں لے آئیں...'

'بہن آپ نغمانہ کی فکر کریں۔ بچے کا فی الحال میں کچھ بندوبست کر لونگی'۔ فریدہ کی ماں بولی۔

'ڈال دو اسے یہیں دریا میں۔ میں اسے گاؤں نہیں لے جاؤنگی۔ اور بچہ مار دو۔ مار دو کمبخت کو'۔ میں نے کہا۔ میرے حواس ٹھکانے نہ تھے۔

بہر حال نغمانہ کو لیکر میں گھر آ گئی۔ باپ مارے صدمے کے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ دو دن گزر گئے تو میں نے دل کڑا کر کے صورت حال بتائی۔۔۔ دل کے مریض تو تھے ہی لمحوں میں جان دے دی۔

میں بے اولاد کے بھی ہو گئی اور بیوہ بھی۔ کوئی معمولی بات ہوتی تو شاید چھپ بھی جاتی۔ تمہارے نانا کو خدا نے بہت عزت اور رتبہ دیا تھا۔ دور نزدیک کے لوگ انہیں جانتے تھے۔ بات چند دنوں میں باہر آ گئی اور اچھا تھا کہ وہ نہیں تھے۔ دنیا کی نظروں کا مقابلہ تو نہیں کرنا پڑا۔

میں بہت سخت جان تھی۔ دکھوں کی ماری دنیا کا مقابلہ کرنے کیلئے اکیلی رہ گئی تھی۔

ذرا ہوش آیا تو تمہاری یاد بے چین کرنے لگی۔ سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اور بے اختیار جا کر تمہیں فریدہ کی ماں سے لے آئی۔ تمہیں سینے سے لگایا تو سوچا کس منہ سے میں نے تمہیں مار دینے کو کہا تھا؟

میں نے دنیا سے کان آنکھ بند کر کے تمہیں اپنے دل سے لگا لیا۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر میں جینے لگی۔ تم میں میری جان تھی!

پانچ سال کے ہوئے تو اس ڈر سے کہ کوئی تمہارے آگے تمہاری ماں کا ذکر نہ کر دے تمہیں لے کر سوئٹزرلینڈ میں داخل کر دیا۔ تمہیں خدا اور اسماعیل کے حوالے کر کے اپنی ممتا پر پتھر رکھ کر میں واپس آ گئی۔۔۔'

'بس نانو۔' وہ تڑپ کر بولا۔ 'آگے مجھے معلوم ہے۔ کیوں اسماعیل بابا میرے باپ کے متعلق کچھ بتانے سے گریزاں تھے۔ کیوں میرے اس سوال پر کہ میری شکل میری ماں پر گئی ہے یا باپ پر؟ یہ کہہ کر میرا منہ سختی سے بند کر دیا تھا کہ یہ سوال کبھی بھول کر بھی اپنی نانو سے مت کرنا۔ وہ پہلے ہی تمہارے ماں باپ کے غم میں نڈھال ہیں۔ انکے ذکر سے انہیں دل کے دورے پڑنے لگیں گے۔ تب سے مجھے یہ سوال بہت خوفناک لگنے لگا تھا۔ اور بعد میں۔۔۔ کیوں آپ مجھے ملک نہیں آنے دے رہی تھیں، کیوں وہیں شادی کر لینے کو کہہ رہی تھیں اور کیوں آپ کی کوشش تھی کہ میں کسی طرح وہیں رکا رہوں۔۔۔'

'شاہ جان میں تو تمہاری دید کو بے قرار رہتی تھی۔ کبھی تو تم نے آنا ہی تھا۔ یہ بات کبھی تو تم نے جاننی ہی تھی مگر۔۔۔ مجھ میں حوصلہ نہیں تھا تمہیں یہ سب بتانے کا۔ اور تمہارا ردعمل دیکھنے کا۔۔۔"

"اچھا ہوا مجھے جنم دینے والی زندہ نہیں ہے۔ ورنہ آج میں اسے اپنے ہاتھوں مار دیتا۔' وہ اچانک سیدھا ہوتے ہوئے حقارت سے بولا۔ "اور۔۔۔ اور۔۔۔ آپ نے مجھے کیوں زندہ رہنے دیا۔ اپنی ممتا کو تسکین دینے کی خاطر کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں زندہ رہ کر جیؤں گا کیسے؟ لوگوں کو کیسے فیس کرونگا؟ دنیا کو کیا منہ دکھاؤنگا؟ مجھے جنم دینے والی کیساتھ ساتھ دنیا مجھ پر بھی تھوکے گی۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے نفرت ہو گئی ہے دنیا کی ہر عورت سے۔۔۔ زہر لگنے لگی ہے۔۔۔" وہ کتنی دیر تک اپنی جنم دینے والی کو کوستا رہا تھا۔

اس رات تو وہ سونے کی گولیاں لے کر دکھوں سے بیگانہ ہو گیا تھا مگر۔۔۔

اگلے دن۔۔۔ اسے یقین ہو گیا وہ دنیا کی نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب لوگ جو گھر میں تھے، جو انڈسٹریز میں تھے، جو دور پار نانو کے جاننے والے تھے، سبھی اس بات سے واقف تھے اور وہ ان کی مذاق اڑاتی نگاہوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں سے بعض کی ہمدردیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، اپنے اوپر پڑتی مترحم اور ترس بھری نظروں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تو اپنے گھر کے ملازموں یہاں تک کہ اسماعیل بابا سے بھی نظریں ملاتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔

درد حد سے سوا ہو گیا تھا۔ دکھ بے تحاشہ بڑھ گیا تھا اور۔۔۔
کوئی بھی راستہ، کوئی بھی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔
فرار کیلئے اس درد سے، بھاگنے کیلئے اس دکھ سے اور۔۔۔
تھک کر۔ ہار کر۔۔۔

اس نے بھاری طاقت کے سلیپنگ پلز کی پوری بوتل منہ میں انڈیل لی تھی۔

اسے پتہ نہیں چلا۔ کہ کس طرح اسے ہوسپٹل پہنچایا گیا مگر ـــــ

اسکی جان بچالی گئی۔ بقول نانو کے ابھی انکی جان لینی اللہ کو منظور نہیں تھی اسلئے اسکی جان انہیں بخش دی گئی۔

ڈاکٹرز نے اسے تبدیلی آب وہوا کا مشورہ دیا تھا اور ـــــ

جب اسے پتہ چلا کہ شائی یہاں اپنی شیپرون کیساتھ پہاڑ پر آئی تھی تو وہ بھی یہاں چلا آیا! اسکے بالکل قریب جگہ حاصل کی اور اس زمین پر اتری جنت کے نظارے اپنے من میں سمونے لگا۔

پرلی طرف اونچی پہاڑی پر بنے قدیم گرجے کے کلاک نے چار بجائے تو وہ چونکا۔

آج باوجود آرام کی گولیاں لینے کے اسے نیند نہیں آئی تھی اور ـــــ اس نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔

سگریٹ ـــــ وہ کبھی کبھار ایک آدھ سگریٹ پی لیتا تھا۔ یہ تو ـــــ یہ تو اس لڑکی شائی کی اسے گالی دینے کے بعد سے اس نے زیادہ پینے شروع کر دیئے تھے۔ پھر آج تو اس نے حد کردی تھی۔ اسی طرح اُسے یہاں پہلی بار دیکھ کر بھی وہ بہت ڈسٹربڈ رہا تھا۔ اسی طرح اسے نیند نہیں آئی تھی اور اسی طرح بہت سارے سگریٹ راکھ کر ڈالے تھے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا۔ باتھ روم میں گیا۔ نماز کی تیاری کرنے لگا۔

اور ساتھ ہی اس نے سوچا وہ سگریٹ کم کر کے آہستہ آہستہ بالکل چھوڑ دیگا۔ اور ـــــ

اپنے اوپر آئی افتاد کا ڈٹ کر مقابلہ کریگا۔ کہ اسے بھی اس دنیا میں جینے کا حق تھا۔ اتنا ہی جتنا کسی حلال اولاد کا ہوتا ہے اور ـــــ

وہ کتاب اب بھی اسکے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی تھی جس میں لکھا تھا۔

'A child is never illegitimate, they are parents who are illegitimate.'

اگر قصور کیا تھا تو اسے پیدا کرنیوالوں نے نا کہ اس نے!

اور اس عزم کیساتھ وہ کمرے میں آتے ہوئے قبلہ رخ ہو کر اپنے پروردگار کے حضور سربسجود ہو گیا۔ کہ یہاں اسے بہت امن کا احساس ہوتا تھا، بڑے تحفظ کا احساس ہوتا تھا، ڈھیر سارے سکون کا احساس ہوتا تھا!

چھت پر بارش کے موٹے موٹے قطروں کی جلترنگ بج اٹھی۔ تو اسکی آنکھ خود بخود کھل گئی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی پر نظر گئی۔ سات بج رہے تھے۔ بائیں جانب کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش اور بادلوں میں سے اس پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ سستی سے بستر میں کسمساتی رہی۔ پھر اٹھ بیٹھی کہ اب اسے دوبارہ نیند نہیں آنی تھی۔

باتھ روم جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر کھڑکی میں سے بغور دیکھا۔ لمحوں میں ہی جل تھل بارش ہونے لگی تھی اور ــــ اسکے قریبی گیسٹ کے ابھی جاگ پڑنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

وہ مسکرا دی۔ قریبی گیسٹ ــــ اس کے کتنا قریب آ گیا تھا!

منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیئے۔ گرے پر مہندی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والا ڈریس اسے بہت سیچ کر رہا تھا۔ مہندی رنگ کی جیکٹ اور ہم رنگ لیدر کے شوز پہنتی وہ کچن میں آ گئی۔

پھپھو وہیں بیٹھیں گرم گرم چائے پیتیں صاحبو کاکا سے محو گفتگو تھیں۔

''آج جلدی جاگ گئیں ہاں؟''۔ پھپھو اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

''بارش اتنے زور سے پڑنے لگی کہ آنکھ کھل گئی''۔

''چلو صاحبو۔ فٹافٹ ناشتہ تیار کرو۔'' پھپھو صاحبو سے مخاطب ہوئیں۔

''جی آپا''۔ اور واقعی مستعدی سے دونوں کیلئے ناشتہ بنانے لگا۔

دونوں نے وہیں کچن میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ دیر تک باتیں بھی کرتی رہیں۔

پھپھو صاحبو کو دوپہر کے کھانے کا بتانے لگیں تو شائی اپنے بیڈ روم آ گئی۔

الماری کھول کر پڑھنے کیلئے ناول پسند کرنے لگی۔ پھر ایک کتاب اٹھا کر کھڑکی کے پاس آرمڈ چیئر پر آ بیٹھی۔ اوراق الٹ پلٹ کرنے لگی۔

بارش ہلکی پڑ گئی تھی۔ بادلوں کی وہ یلغار بھی نہ رہی تھی۔ کھڑکی کے اس پار سب صاف نظر آنے لگا تھا۔

شہباز خان کے ناشتے میں ابھی بھی کچھ وقت تھا۔ دھیرے سے مسکراتے ہوئے اس نے ناول کا پہلا صفحہ کھولا۔

پڑھنے میں معروف ہو گئی مگر ــــ نظریں بار بار کھڑکی کی طرف اٹھ جاتیں۔

پھر ــــ اس کی نظریں اپنی کلائی کی گھڑی پر گئیں۔ وہ چونکی نو بج چکے تھے۔ شہباز خان ابھی تک برآمدے میں آیا کیوں نہیں تھا؟ ناشتے کے بھی کوئی آثار نہیں تھے۔

وہ کچھ مایوس سی ہوئی۔ بے دلی سے صفحات پر نظریں دوڑانے لگی۔

ساڑھے نو ہو گئے۔ اسکا کوئی پتہ نہیں تھا۔ آج کیا بات تھی؟ وہ تو وقت کا اس قدر پابند تھا کہ گھڑی کی سوئی ادھر ادھر ہو سکتی تھی وہ اپنے اوقات سے نہیں ہلتا تھا۔

وہ بے چین سی ہوئی۔ کتاب پر توجہ دینے کی کوشش کی مگر بے سود! ذہن اسی کی طرف لگا ہوا تھا۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی اسکے برآمدے میں آ کر ناشتہ نہ کرنے کی؟

دس بج گئے۔ اسکی بے کلی بڑھنے لگی۔ اب وہ خالی خالی نظریں سطور پر دوڑا رہی تھی۔

وہ بجھ سی گئی تھی۔ گہری مایوسی کیساتھ اداسی نے بھی آ لیا تھا۔

کتاب ہاتھ میں لئے لئے وہ اٹھ کر باہر برآمدے میں پھپھو کے پاس آ بیٹھی۔ پھپھو پھر اخبار اور تسبیح دونوں بیک وقت نمٹا رہی تھیں۔

بارش تھم گئی تھی، سر بفلک پائینز دھل کر نکھر آئے تھے، سنہری دھوپ ہر سو پھیل گئی تھی۔

کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے وہ ایک بار پھر کتاب پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

''گیارہ بجے شمشاد بیگم کی طرف جائینگے۔ بڑے اصرار سے بلایا ہے۔'' شمشاد بیگم

پھپھو کی وہی پارک والی ہم عمر دوست تھیں۔

''گیارہ بجے؟'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔

گیارہ بجے تو وہ نیچے ریسٹورانٹ میں جاتی تھی۔ کوک یا آئس کریم کی آڑ میں شہباز خان کو ایک نظر دیکھنے۔

''گیارہ بجے کے بعد نہیں ہو سکتا۔'' وہ معصومیت سے پھر سے بولی۔

''چلو بعد میں سہی۔ میں بھی ذرا وظیفہ کر لونگی۔'' پھپھو نے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات''۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

کتاب پر پھر سے نظر ڈالی۔ مگر من نہیں لگا اب بھی۔ اکتائی اکتائی سی اٹھ کر اندر آ گئی۔

کتاب بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بستر میں گھس گئی۔ صبح اتنی سویرے جاگی تھی ذرا آنکھ ہی بند کر لیتی۔

کچھ بے کل سی تھی اب بھی۔۔۔ ٹھیک گیارہ بجے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے اور بالوں پر برش کرتی باہر آ گئی۔

''پھپھو نیچے جائیں گی۔ آئس کریم نہیں کھائی بہت دنوں سے آپ نے''۔

وہ اس کی بات کے انداز پر شفقت سے ہنس دیں۔

''بیٹا دانت میں درد ہو جاتا ہے آئسکریم کھانے سے۔ کم بخت ہر بار بھول جاتی ہوں شاکر سے کہنا کہ لے جا کر کسی دانتوں کے ڈاکٹر کو دکھا دے...''

''آپ چائے پی لیں''۔ شائی نے تجویز پیش کی۔

مگر پتہ نہیں کیا تھا؟ پھپھو کا کچھ دنوں سے ریسٹورانٹ میں جانے کا کوئی خاص موڈ نہیں بنتا تھا۔ شاید کوک اور آئس کریم کی وجہ سے۔ چائے تو وہ تقریباً روزانہ نیچے سموسوں کی دکان پر پی ہی لیتی تھیں۔

''اے بیٹا تم جاؤ میں بس یہ وظیفہ آج ختم کر ہی لوں تو اچھا ہوگا''۔

تو پھپھو کا آج بھی ارادہ پکا تھا ریسٹورانٹ میں نہ جانے کا!

کچھ سوچتی ہوئی وہ پگڈنڈی پر اترنے لگی۔ ناشتے پر وہ برآمدے میں نہیں آیا تھا مگر کوفی پینے تو گیا ہوگا نیچے۔۔۔ اس کے تصور سے ہی اسے گھبراہٹ شروع ہوئی۔

دل تھا کہ دھڑک دھڑک کر جیسے باہر آ رہا تھا۔ آج تو وہ پہلے سے بھی کئی گناہ زیادہ کنفیوزڈ ہو رہی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔ کاؤنٹر پر جا کر آئس کریم کا کہا اور۔۔۔ ادھر ادھر دیکھے بنا اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

دل قدرے تھما، کنفیوژن کچھ کم ہوئی تو۔۔۔

اس نے جھجکتے جھجکتے سامنے نگاہ کی۔

دل دھک سے رہ گیا۔ وہ تو وہاں نہیں تھا۔ یہ کیسی بات تھی!

اتنے دنوں میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ سختی سے پابند تھا وقت کا۔ ٹھیک گیارہ بجے، ٹھیک اپنی اسی سیٹ پر۔۔۔ وہ روزانہ موجود رہتا تھا!

آج کیا بات تھی؟ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

مارے مایوسی کے اسکے سارے بدن میں کمزوری کی لہر سی دوڑ گئی۔

اس نے آئس کریم بھی کھائی مگر۔۔۔ جیسے ہاتھوں میں طاقت نہ رہی تھی، کمزور پڑ گئے تھے اعضاء سارے۔

اداس سی سوچوں میں غلطاں وہ اوپر سویٹ پر آ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' پھپھو اب بھی برآمدے میں تھیں۔ اسکے چہرے کی بے رونقی انہوں نے بھی محسوس کر لی۔

''کچھ نہیں''۔ بے جان سی مسکراہٹ سے وہ چہرے کی رونق بحال کرنے لگی۔

''چلو۔ شمشاد بیگم کے یہاں جاتے ہیں''۔ وہ کام سمیٹتے ہوئے اٹھنے لگیں۔

''چلیں''۔ اسکی آواز بھی مدھم لگ رہی تھی۔

دونوں اونچے نیچے راستوں پر چلتیں شمشاد بیگم کے یہاں چل دیں۔

پھپھو اور شمشاد بیگم یوں گلے ملیں جیسے مدتوں بعد دیکھا تھا ایک دوسرے کو۔ شائی کو

اچھا لگتا تھا پھپھو اور شمشاد آنٹی کا یوں ملنا جلنا۔

انہوں نے انہیں زبردست چائے پلائی۔ خوب خوب خوش ہوئیں دونوں کو اپنے یہاں پا کر۔ بڑی گپ شپ بھی ہوئی۔ شائی کا بھی دھیان قدرے بٹ گیا۔ ایک بجے کے قریب پھپھو نے ان سے اجازت لی۔ گوان کا اصرار تھا کہ آج بینگن پکائے تھے انہوں نے اور وہ دونوں کھانا ضرور کھا کر جاتیں!

''پھپھو۔ کہیں چلتے ہیں''۔ واپسی پر شہباز خان کی طرف خیال پلٹتے ہی اس نے پھپھو سے کہا۔ وہ جیسے یہاں سے اچانک اکتا گئی تھی۔

''کہاں چلو گی بیٹا؟''

''بس کہیں بھی''

''لو۔ یہ کیا بات ہوئی''۔

''بس جہاں آپکا دل چاہے۔ وہیں چلیں گے آج''

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ پھپھو خوش ہو گئیں۔ چند ثانیے سوچتی رہیں۔

''شہر چلتے ہیں''۔ انہوں نے قریبی پہاڑی شہر کا فیصلہ دے دیا۔

وہاں بہت گہما گہمی ہوتی تھی۔ ہوٹل تھے، گیسٹ ہاؤس تھے، بازار تھے، ریسٹورانٹ تھے۔ اور سیاح جوق در جوق امڈ آتے تھے۔ شام کو وہاں کی رونق دوبالا ہو جاتی تھی۔

کھانا کھاتے کھاتے انہیں دو بج گئے۔

شاکر گاڑی نیچے سڑک پر لے آیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اس نے ایک نظر اوپر شہباز خان کے سوئٹ پر ڈالی مگر ـــــ

نظریں ایک بار پھر مایوس ہو کر واپس پلٹ آئیں۔ آج وہ لنچ پر بھی نہیں گیا تھا۔

'... جبھی تو ڈاکٹرز نے تبدیلی آب و ہوا کیلئے کہا...'

'... اور خاص طور سے بیماری سے اٹھنے کے بعد تو...' معاً اسکے کانوں میں اسکے پی اے اور اسماعیل بابا کی بات گونجی۔

کہیں وہ بیمار تو نہیں تھا؟

اداس اداس سی وہ پھپھو کیساتھ ہر جگہ گھومتی رہی، کھانے پینے میں بھی ان کا ساتھ دیتی رہی، ضروری شوپنگ بھی کی۔

لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ الامان۔ رنگ برنگے لباسوں کا سیلاب سا امڈ آیا تھا، چہروں پر خوشیوں کا نور سمٹ آیا تھا۔ مگر ـــــ

وہ مرجھائی مرجھائی تھی، افسردہ افسردہ تھی،

اندھیرا خاصا بڑھ گیا تھا، سردی سوا ہو گئی تھی، اردگرد سیاہ بادلوں میں بجلیوں کی چکا چوند شروع ہو گئی تھی۔

وہ لوگ رات کا کھانا وہیں ایک اچھے سے ریسٹورانٹ میں کھا کر واپس لوٹے۔

دن کو بھی آرام نہیں کیا تھا، شام کو گھومتے پھرتے تھک بھی گئی تھی۔ بستر پر جاتے ہی نیند نے آلیا۔

صبح نو بجے اسکی آنکھ کھلی۔ پہلی نظر قریبی کھڑکی پر ڈالی۔ مطلع صاف تھا، سنہری دھوپ اردگرد پھیل چکی تھی، پُرجلال پائینز نکھرے نکھرے تھے۔ مگر ـــــ

شہباز خان ـــــ آج بھی اپنے برآمدے میں موجود نہیں تھا۔ میز اور کرسی اسکی مخصوص جگہ پر لگے تھے لیکن ـــــ حسب معمول ناشتہ یا وہ خود ـــــ کہیں نظر نہ آرہے تھے۔

وہ کل سے کہیں زیادہ مایوس نظر آنے لگی۔ بے دلی سے اٹھ کر باتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھونے، تیار ہوئی اور واپس کمرے میں آکر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

اردگرد دیکھا۔ آس پاس اسکے کوئی آثار نہیں تھے۔ موجود تو وہ یقیناً تھا کہ ادھر اُدھر اسکے ملازم نظر آرہے تھے۔ سویٹ میں بھی اسکی حاضری کے آثار تھے مگر۔

وہ بے چین سی ہوگئی۔ وہ یقیناً بیمار تھا!

پھپھو کیساتھ باہر برآمدے میں بیٹھ کر اس نے ناشتہ کیا۔ اسکے بعد وہ دیر تک وہیں بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔ گو وہ قدرے بے کل سی تھی، قدرے بے قرار سی تھی۔

گیارہ بجنے سے پہلے ہی اس نے کتاب ختم کر لی۔

تھکی تھکی سی ایک سانس لیتی۔۔ اندر کمرے تک آگئی۔ اپنے پڑھے ہوئے ناولوں میں یہ ناول بھی رکھ لیا۔ کچھ دیر وہیں کھڑی ہو کر وہ ان پڑھی کتابوں پر نظریں دوڑانے لگی۔

تبھی وہ باتوں کی آواز پر چونکی۔ گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

شہباز خان تھا۔ بلیک کوٹ اور آف وائیٹ پینٹ میں ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہا تھا۔

اسکا دل مارے خوشی کے اچھل سا پڑا۔ ایسا لگتا تھا مدتوں بعد اسے دیکھا تھا۔ سب چھوڑ چھاڑ۔۔ اسی طرف متوجہ ہوگئی۔

اور۔ اسکے وسوسے صحیح نکلے۔ وہ ضرور کل بیمار رہا تھا۔

اسکا پرکشش چہرہ اترا اترا سا تھا، دلنشیں آنکھیں کربناک اور مزاج چڑچڑا چڑچڑا سا تھا۔

"چھوٹے سرکار۔ کوفی آپ کیلئے زہر ہے۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے"۔ قریب کھڑے اسماعیل بابا اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسکے چوڑے ماتھے پر شکن تھے، اور ارادہ اٹل!

"بابا ـــــ میں کوفی پیوں گا۔ ادھورا ادھورا لگتا ہے اپنا آپ۔ اسکے بغیر..."

"صرف کچھ عرصہ کیلئے۔ دیکھیں کل کا سارا دن آپ نے کیسے گزارا ہے۔ کچھ تو خیال کریں"۔ بابا کے لہجے میں التجا تھی۔

لیکن ـــــ وہ بھی شاید مجبور تھا۔

"بابا بہت مشکل ہے... میں..." وہ آگے بڑھنے لگا۔

اور بابا ـــــ جلال میں آگئے۔

"شہباز خان۔" ان کے لہجے میں تیزی آگئی۔ سارے آداب بھلا بیٹھے۔

شہباز خان ٹھٹھک کر رک گیا۔

"آپ نہیں جائینگے۔ میں یہاں آپکی نگرانی کیلئے ہوں۔ جھک مارنے کیلئے نہیں۔ نہیں پی سکتے آپ کوفی..."

اور شہباز خان نے ہتھیار ڈال دیئے۔

چپ چاپ واپس مڑنے لگا۔

"بیٹا میں نے آپکو ان ہاتھوں میں پال پوس کر بڑا کیا ہے"۔ بابا خود بخود نرم پڑ گئے۔ "آپکی زندگی میرے لئے بہت اہم ہے۔ آپکی صحت کا خیال رکھنا میرا فرض ہے"۔ انکی بوڑھی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"بابا مجھے معاف کر دیں۔ پلیز بابا..."

اسکا چہرہ اذیت ناک لگ رہا تھا، آنکھوں کا کرب سوا ہو گیا تھا۔ لہجے میں درد اتر آیا تھا۔

"آئیں چھوٹے صاحب۔ اندر چلیں"۔ بابا نے اسے کندھے سے تھاما اور۔ دونوں سویٹ کے اندر چلے گئے۔

وہ چونکی___ خود وہ کتنی اداس ہوگئی تھی، کتنی دکھی ہوگئی تھی!

آہستہ قدم چلتی وہ برآمدے میں آگئی۔ پھپھو وہاں نہیں تھیں۔ انکی چائے کا وقت تھا ضرور وہ کچن میں تھیں۔ اور صاحبو کاکا سے ملکی حالات پر محو گفتگو!

چند لمحے وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی۔

نیچے ریسٹورانٹ میں جائے کوک پینے یا نہیں؟

کیا ضرورت تھی جانے کی۔ شہباز خان تو ویسے بھی نہیں گیا تھا۔ اسکے معصوم دل نے کہا۔

اور وہ___ یوں ہی آگے چل نکلی۔

قدم قدم پر سفید ڈیزی بکھرے پڑے تھے۔ وہ جھک جھک کر اکٹھے کرنے لگی۔ منٹوں میں ہی بڑا سا خوبصورت گلدستہ بنالیا۔ یہ وہ شہباز خان کو بھیجے گی۔ وہ بیمار تھا۔

گلدستہ ہاتھ میں لئے وہ بلا مقصد ادھر ادھر گھومتی رہی۔ ایک خاتون ملیں، علاقے میں شاید نئی آئی تھیں، چند باتوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں، وہ حتی الوسع معلومات فراہم کرتی رہی اور پھر___

واپس سویٹ کی طرف آگئی۔

پھپھو سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ اسکی نظر خواہ مخواہ ہاتھ میں پکڑے پھولوں پر گئی۔ جانے کیا ہوا؟ جلدی سے اپنے پیچھے چھپالئے۔ پھر___ وہ مسکرادی۔ اسی کے دل میں چور تھا ورنہ پھپھو کو کیا معلوم تھا کہ پھول کس مقصد کیلئے تھے؟

اسکے باوجود___ وہ پھول اپنے پہلو کی طرف کئے پھپھو کے آگے سے سیدھی نکل گئی۔

باتھ روم میں سے گلاس میں پانی لیا اور یہ بڑا سا گلدستہ سجا کر اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ لیا۔

کچھ ہلکی پھلکی سی، خوش سی، مطمئن سی وہ باہر آگئی۔

پھپھو سے باتیں کرتے ہوئے وہ یہی سوچتی رہی کہ شہباز خان کو وہ پھول بھجوائے گی

تو کیسے؟

دوپہر کھانے پر اسکے پسندیدہ مٹر چاول اور قیمہ بھری مرچیں بنی تھیں۔ وہ خوشی خوشی کھا رہی تھی۔ پھپھو بھی اچار ملا ملا کر لذیذ چاولوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"پھپھو تھوڑا سا اچار میں بھی لے لوں"۔ رات سے اس کا گلا خراب تھا۔

"ہوش کے ناخن لو بیٹا۔ رات گلے سے نوالہ نہ اترتا تھا اتنا خراب تھا گلہ۔ یہ موئی روز روز کی آئس کریم۔ میں حیران ہوں اس قدر ٹھنڈ میں یہ کم بخت آئس کریم بیچتے کیوں ہیں..."

"کیا ہوا پھپھو۔ تھوڑا سا کھانے دیں"۔ اسکا پھپھو کو دیکھ دیکھ کر بہت جی للچا رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔ اور پھر بچوں کو اچار کھانا بھی نہیں چاہئیے"۔

"اب تھوڑا تھوڑا کھالینا چاہئیے۔ کیوں کہ اب میں کچھ کچھ بڑی ہوگئی ہوں"۔ پھپھو کیساتھ اسکے لاڈ کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

"جمعہ جمعہ آٹھ دن پیدائش کو ہوئے اور بڑی ہوگئی"۔

"آج میں نیچے سے کوئی خرید کر لاؤنگی"۔ غیرارادی طور پر شاید وہ شہباز خان کی کوئی کی عادت کو اپنانے کی خواہش کرنے لگی۔

"یہ کہاں سے سر میں آسمائی"۔ وہ واقعی گھبرا گئیں۔ "خبردار جو کوئی کے بارے میں سوچا بھی۔ نشہ ہے نشہ"۔

اور وہ دھیرے سے مسکرادی۔ شہباز خان کو بھی صبح اسماعیل بابا سے ڈانٹ پڑی تھی۔ بہت اچھا لگا تھا اسے۔

اور___ شہباز خان اسماعیل بابا کا کتنا خیال رکھتا تھا۔ آج اسے اندازہ ہوا۔

کھانے کے بعد وہ اپنے بستر پر پڑ رہی۔

تبھی اسے خیال آیا۔ وہ پھولوں کا گلدستہ اسے کیسے بھجوائے گی؟

صاحبو کاکا کے ہاتھ؟ باپ رے۔ سوچ سے ہی وہ گھبرا گئی۔

اسماعیل بابا کے ذریعے؟ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ پھپھو نے، صاحبو کاکا یا پھر شاکر کاکا

نے؟

وہ الجھ الجھ گئی۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ کم از کم اس کے بس کا نہیں تھا!

مگر وہ چاہتی بھی تو تھی کہ اسے صحت یابی کیلئے Wish کرے۔

بہت سوچا، بہت غور کیا، پر کوئی حل نظر نہیں آیا۔

پھر۔۔۔ اسے اپنی معصوم سی خواہش دل میں ہی دبانا پڑی۔ جھنجھلائی سی اٹھ کر اس نے گلدستہ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر بائیں طرف کھڑکی میں رکھ لیا۔ دوبارہ بستر پر آ لیٹی۔

اسے نیند نے آ لیا تھا شاید۔ آنکھ کھلی تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔

باتھ روم جا کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ گھنے بالوں پر برش پھیرا اور پھپھو کے پاس برآمدے میں آ گئی۔

پھپھو حسب معمول قریبی سویٹ کی طرف پیٹھ کئے اپنی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ان کے مقابل اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئی۔

صاحبو کاکا چائے کیساتھ ڈھیر سارے گرم گرم چپس اور ٹمیٹو ساس لے آئے۔

دونوں مزے لے لے کر کھانے لگیں۔

تبھی اس نے دیکھا۔ شہباز خان کی گھڑ سواری کیلئے سائیس گھوڑا لئے اسکے سویٹ کے قریب آ پہنچا۔

تھوڑی ہی دیر میں اسماعیل بابا اسکے لئے چائے اور بسکٹ لئے آئے۔

کچھ ہی دیر میں شہباز خان بھی جینز اور جیکٹ پہنے باہر آ گیا۔

وہ اسکے بالکل سامنے تھا، تین چار قدم کی اونچائی پر۔۔۔ رخ بھی اسی کی طرف تھا۔

اسکا دل یکبارگی دھڑکا، ہاتھوں میں پکڑا کانٹا لرز گیا، نظریں چار ہونے کے خدشے سے لڑکھڑا گئیں۔

پھر۔۔۔ اس نے ہمت کر کے اوپر دیکھا۔

وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ مگر۔۔۔

معمول کے مطابق نظریں اس پر جمی نہیں تھیں۔ چہرے پر ڈھکی چھپی شوخی نہیں تھی۔ پرکشش ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔

لگتا تھا اسکے سامنے ان کا سویٹ تو تھا مگر کوئی ذی روح موجود نہیں تھا!

پھر۔۔۔ وہ مڑا۔۔۔ گھوڑے پر بیٹھا اور پچھلی چڑھائی چڑھنے لگا۔ اس سے نظریں ملائے بغیر ہی، چہرے پر اپنائیت لئے بغیر ہی، ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ لئے بغیر ہی!

کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ چپس کھانے لگی۔ لیکن۔۔۔ اسکا خوبصورت چہرہ ضرور کمہلا گیا تھا، انداز میں مایوسی ضرور آ چلی تھی۔

چائے سے فارغ ہو کر وہ اور پھپھو نیچے چلی گئیں۔ ٹیلیفون ایکسچینج بھی گئیں، خوش قسمتی سے کال بھی مل گئی، پاپا سے بات بھی ہو گئی۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ لوگ چلڈرن پارک میں گئیں۔ پھپھو شمشاد بیگم سے باتوں میں مصروف ہو گئیں اور وہ۔۔۔ حسب معمول جھولے جھولتی، سی سا پر بیٹھتی، میری گو راؤنڈ پر آ بیٹھی تھی۔

پربتوں کے پیڑوں پر شام بسیرا کرنے لگی تھی۔ سرمئی اندھیرے، چمپئی اجالے آپس میں گڈ مڈ ہونے لگے تھے۔ اور سردی سوا ہو گئی تھی۔

خوبصورت دھاری دار جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے وہ پھپھو کیساتھ واپس ہوٹیل کی طرف چلی جا رہی تھی۔

سڑک پر اکا دکا ہی کوئی نظر آ جاتا تھا ورنہ سبھی ٹورسٹس اپنی اپنی جائے پناہ پر جا چکے تھے۔

وہ سوچوں میں گم سر جھکائے آہستہ آہستہ پھپھو کے ساتھ رواں دواں تھی۔

معاً وہ گھوڑے کے آہستہ آہستہ اٹھتے ٹاپوں کی آہٹ پر چونکی۔۔۔ بائیں دیکھا۔ شہباز خان تھا۔ ایک بار پہلے کی طرح ڈھلان اترتا سڑک پر آ رہا تھا۔

ڈھلان اتر چکا تھا، سڑک پر آ چکا تھا، چند ساعتوں کیلئے بالکل اسکے پاس سے ہو کر جا رہا تھا۔

لیکن۔۔۔ نظریں ایک بار بھی اسکی نظروں سے ملی نہیں تھیں، نہ ہی نقوش پر اپنائیت چھائی

تھی، نہ ہی لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

کیوں تھا ایسا؟ اسے سخت حیرت ہوئی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ سڑک پر اسکے اور پھپھو کے علاوہ کوئی تیسرا تو تھا نہیں۔ وہ انکے آس پاس اردگرد دیکھ رہا تھا مگر نہیں دیکھا تھا تو بس حسب معمول اسکی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔ بالکل جیسے سب دیکھ بھال رہا تھا۔ مگر —— جانتا نہیں تھا جیسے اسے!

ایسا کیوں تھا؟ وہ الجھ الجھ گئی۔

وہ سڑک پر خاصا دور نکل گیا تھا۔ پر —— اسے اداس کر گیا تھا، دکھی کر گیا تھا۔

رات نو بجے اس نے کچن کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ سیاہ پینٹ اور آف وائیٹ کوٹ پہنے وہ نیچے ڈنر کیلئے جا رہا تھا۔

اداس سی سانس لیتی وہ وہاں سے ہٹ آئی۔ پھپھو کے پاس لونگ میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہیں ان کیساتھ کھانا بھی کھایا، ٹی وی بھی دیکھتی رہی مگر ——

ننھا سا دل بوجھل بوجھل تھا! اداس اداس تھا!

پھپھو کیساتھ اس نے بھی عشاء کی نماز پڑھی اور کمرے میں آتے ہوئے چپکے سے اپنے بستر میں گھس گئی۔

خاصی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ بے چینی سے، بے کلی سے۔

پھر —— آنکھ لگ ہی گئی۔

صبح دس بجے اسکی آنکھ کھلی۔ حسب معمول پہلی نظر بائیں طرف کھڑکی پر گئی۔ شہباز خان اپنے برآمدے میں بیٹھا اطراف کے سحر انگیز حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

وہ شاید ناشتہ کر چکا تھا۔ اب حسب عادت یہاں کے روح پرور مناظر اپنے قلب میں اتار رہا تھا۔

اسے دیکھ کر آج اسے وہ والی دیوانہ وار خوشی نہیں ہوئی۔ جانے کیوں؟ اسے اپنے اور اسکے درمیان فاصلے سے محسوس ہونے لگے تھے۔

کمبل پرے ہٹاتے ہوئے وہ باتھ روم گئی۔ نہانے کے بعد مسٹرڈ رنگ کے نرم وگرم کپڑے پہنے، ساتھ ہی سفید خوبصورت سویٹر اور سفید شوز پہنے۔

کمرے سے نکلتے نکلتے چپ چاپ ایک نظر اس پر ڈالی اور خاموشی سے پھپھو کی طرف آ گئی۔

وہ ناشتہ کر چکی تھیں۔ آج بستر میں ہی گھسی اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑا رہی تھیں۔

''صاحبو''۔ پھپھو نے اسے دیکھتے ہی صاحبو کو آواز دی۔

''جی آپا''۔ وہ فوراً ہی کچن سے آ گیا۔

''شائی کیلئے ناشتہ بناؤ''۔

''بس ابھی لیجئے''۔ وہ واپس پلٹا۔

''پھپھو کوئی خاص خبر؟'' وہ یوں ہی بولی۔

''بس بیٹا روز ہی اس آس میں اخبار پڑھتی ہوں کہ وزیراعظم نے استعفیٰ دیدیا ہو گا مگر مجال ہے کہ وہ کرسی چھوڑے...'' وہ اب بھی اخبار پر نظریں جمائے تھیں۔

شائی مسکرادی۔ پھپھو کو وزیراعظم ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔

"پھپھو آپ اخبار پڑھیں۔ میں باہر ناشتہ کرلونگی"۔

"جاؤ بیٹا"۔

وہ باہر برآمدے میں آگئی۔ آہستہ سے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے یوں ہی ادھر ادھر سرسری نظریں دوڑانے لگی۔

صاحبو نے اس کے آگے میز پر ناشتہ لگادیا۔

سوچوں میں کھوئی وہ دھیرے دھیرے ناشتہ کرنے لگی۔ فارغ ہوئی تو صاحبو نے آکر برتن اٹھالیئے۔ وہ اب بھی وہیں بیٹھی خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔

تبھی چونکی۔۔۔ سامنے ہی شہباز خان اپنے سویٹ کے دروازے سے برآمد ہورہا تھا۔

اسکے پی اے نے اس کیلیئے دروازہ تھام رکھا تھا۔

بیج کلر کے قیمتی سوٹ میں وہ ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

دروازے سے نکلتے نکلتے اسکی نظریں شائی پر پڑیں۔ نظریں ملیں۔ مگر ۔۔۔

اسکی نظروں میں کوئی شناسائی نہیں تھی، کوئی یگانگت نہیں تھی!

بالکل سپاٹ تھیں، کوری تھیں!

جیسے روز اس سے مڈبھیڑ ہی نہ ہوتی ہو، جیسے وہ اسکے قریب ترین سویٹ میں ہی نہ رہتی ہو، جیسے وہ اسکی پڑوسن ہی نہ ہو!

وقار سے ڈھلان اترتا شائی کے قریب سے ہوتا وہ نیچے جاتی پگڈنڈی اترنے لگا۔

شائی بے بسی سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

پھر اس نے سوچا۔۔۔ وہ اسکی لگتی بھی کیا تھی جو وہ اس سے امید رکھ رہی تھی کہ وہ اسے پہچانے اور جانے کہ۔

روز اس سے مڈبھیڑ ہوتی تھی، اسکے قریب ترین سویٹ میں رہتی تھی اور۔۔۔ اسکی پڑوسن تھی!

آج نہانے کی وجہ سے اس کا ناشتہ بھی لیٹ ہوگیا تھا مگر۔۔۔ ٹھیک گیارہ بجے اس وقت اسکا ریسٹورانٹ میں جانے کو دل بھی نہیں کر رہا تھا۔

کیا دلچسپی رہ گئی تھی وہاں، کس کو دیکھنے جاتی؟

وہ تو اچانک ہی بدل گیا تھا۔ اجنبی بن گیا تھا۔

مگر وہ کیوں اس سے ان سب باتوں کی آس لگائے بیٹھی تھی؟

کیا اس نے اس سے کچھ کہا تھا؟ کوئی وعدہ؟ کوئی عہد؟

ہاں۔ دل مچلا۔۔۔

زبان سے نہیں کہا تھا پر ۔۔۔

اسکی ہردم بولتی آنکھوں نے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔ مبہم سی مسکراہٹوں نے کئی پیغام دیئے تھے۔

اسے یہاں تک گھوڑ ے پر لایا تھا تو اسکی سانسوں میں مدغم ہوتی اسکی سانسوں نے اسے پیار کرنا سکھایا تھا۔ اور خودا سینے سے جکڑ کر اسکے دل کی دھڑکنوں نے بے ترتیب ہوکر اسکے پیار کا اقرار کیا تھا!

اسطرح سے وہ اسکا اب وہ تھا، ذمہ دار تھا!

مگر۔۔۔ تلخی سے مس ائی تو حسین آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

شاید پیار کیلیئے بھی زبانی بات چیت اور وعدے وعید ہو جانے ضروری ہوتے ہیں۔ جیسے کسی تحریری کاروائی پر کسی گواہ کے دستخط لازمی ہوتے ہیں۔

برآمدے سے اٹھ کر وہ باہر آگئی۔۔۔ یوں ہی بلا مقصد ادھر ادھر گھومتی رہی۔ سفید ڈیزیز اس وقت پھر اسکا ہر قدم چوم رہے تھے۔

اچھا تھا اس نے کل اسے پھول نہیں بھجوائے تھے۔ اسے اچانک خیال آیا۔۔۔ کتنی سبکی ہوتی اسکی!

شام پانچ بجے وہ رائیڈنگ کیلیئے سویٹ سے نکلا ہی تھا کہ اسماعیل بابا نے آلیا۔ موبائل فون پر اسکے لئے پیغام تھا۔ رات دس بجے اسکا دوست پہنچ رہا تھا اور صبح منہ اندھیرے انہوں

نے دوردراز کے برف پوش پہاڑوں میں ہونے والے ایک جشن میں کھیلے جانے والے پولو کے میچ میں شرکت کیلئے جانا تھا۔

وہ اتنا قریب رہتا تھا کہ اسے اسکے پروگرام تک پتہ چل جاتے تھے۔لیکن ۔۔۔ وہ پھر دکھی ہوگئی۔اسکے وہ قریب نہیں رہا تھا۔

وہ برآمدے سے ہٹ آئی۔کہ اب شاید وہ اس میں دلچسپی رکھنے کی حقدار نہیں رہی تھی۔

رات وہ سونے کی تیاری کررہی تھی۔کہ اچانک قریبی گیسٹ کے سویٹ سے فلک شگاف قہقہوں کا سیلاب امڈ آیا۔۔۔ یقیناً اسکا دوست پہنچ گیا تھا۔

''یہ ۔۔۔ یہ جو قریبی سویٹ ہے وہ اسی میں رہ رہی ہے''۔گرم کوفی سے بھاپ کے اٹھتے مرغولوں پر نظریں جمائے شہباز خان نے فاروق، اپنے جگری دوست کو آگاہ کیا۔

''کیا؟'' فاروق حیران ہوا، کوفی کا مگ میز پر رکھ دیا۔

''ہاں''۔وہ ہولے سے بولا۔نظریں اب بھی کوفی کے بھاپ پر جمی تھیں۔

''اور تم ۔۔۔ تم یہاں کیوں چلے آئے؟''

وہ اسکے تمام کیس سے واقف تھا۔شائی کے قریب رہنا ظاہر ہے اسکی ذہنی حالت کیلئے ٹھیک نہیں تھا۔

''اسی کیلئے تو آیا ہوں''۔اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹیک دیا۔خمار آلود آواز مزید بھاری ہونے لگی۔

''کیا مطلب؟ وہ تمہیں اب بھی اچھی لگتی ہے کیا؟ میرا مطلب ہے اسکے اتنا تکلیف دینے کے باوجود...''

''یہ بات نہیں ہے''۔وہ تلخی سے مسکرایا۔

''پھر؟''

''یہاں آکر میں اسے اپنے قریب لانا چاہتا تھا۔ایک حرام کی اولاد کے قریب۔اسے دکھانا چاہتا تھا کہ ایک ناجائز اور جائز آدمی دونوں سے ایک لڑکی یکساں محبت کرتی ہے، اسکی پسند میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔اور بالکل اسی طرح ایک ناجائز آدمی بھی کسی لڑکی سے شادی کا اسی طرح خواہاں ہوسکتا ہے، جسطرح ایک جائز آدمی۔کن حالات اور کن وجوہات میں اسکی پیدائش ہوئی۔پسند یا خواہش پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا...''

فاروق کو آج ایک بار پھر اس پر ترس آ گیا مگر ـــــ ساتھ ہی تشویش بھی لاحق ہوئی۔

''شہباز۔ تم میرے ساتھ واپس چلو۔ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں تو خوش تھا کہ مہینہ دو مہینہ تم یہاں رہو گے، آب وہوا تبدیل ہوگی تو تمہاری صحت پر اچھا اثر پڑیگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم یہاں اسی سے رشتہ جوڑنے آئے ہو...'' اس نے کوفی کا مگ دوبارہ اٹھالیا۔

''تم غلط سمجھے ہو۔ میں ہرگز اس سے رشتہ جوڑنے نہیں آیا۔ مجھے اس سے بے اندازہ نفرت ہے۔ اسکی معصومیت کے پیچھے ایک گھناؤنی صورت ہے یہ میں نظر انداز نہیں کرسکتا...''

تو پھر؟''

''بس اتنا میں اسے سمجھانے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ جس کو وہ حرام کی اولاد کہتی تھی آج اسی کی محبت میں بے قرار ہے۔ اگر ناجائز اور جائز آدمی میں کوئی فرق ہوتا تو آج وہ اس قدر بے چین نہ ہوتی...''

سیدھا ہوتے ہوئے اس نے کوفی کا خالی مگ میز پر رکھا ـــــ تلخی دور پھینکی اور دھیرے سے مسکرایا۔

''کیوں ٹھیک کہا نا''۔

فاروق بھی مسکرا دیا۔

''سلسلہ کچھ دلچسپ معلوم ہوتا ہے''

اگر اسی طرح اسے کچھ سکون میسر آسکتا تھا تو کوئی مذائقہ نہ تھا!

''بہت دلچسپ''

''کیا کیا گپ شپ ہوئی؟'' فاروق اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے اسکے قریب بیٹھ کر ایک بار پھر اپنی اصلیت پر آ گیا۔

''کچھ بھی نہیں''۔ وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔

''خود ہی کہتے ہو بے چین ہے، بے قرار ہے...''

''وہ تو ہے''۔ اسکے پرکشش ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ تھی۔

''تو سناؤ نا۔ آج رات اپنی ہے۔ اسی کے نام کر دیتے ہیں''۔ اس نے دونوں پاؤں اوپر صوفے میں کر لیے۔

''بس ـــــ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے، بہت زیادہ۔ میری راہ دیکھتی ہے، بے کل رہتی ہے۔ اور...''

''اور؟'' فاروق گہری دلچسپی سے بولا۔

''اور ـــــ آجکل بہت اداس ہے، بہت پریشاں ہے''۔

''وہ کیوں؟''

''اسلئے کہ اب میں اسکی پرواہ نہیں کرتا''۔

''کیوں؟''

''پرواہ تو اسکی کی جاتی ہے جس سے کوئی دلچسپی ہو''۔

''دیکھو شہباز۔ بات ایسے نہیں بنے گی۔ شروع سے لے کر آج تک کے واقعات مفصل بتاؤ۔ کب، کہاں، اور کیسے ملاقات ہوئی۔ بتدریج ترقی اور پھر شاید زوال ـــــ زوال کے بھی اسباب بتاؤ۔''

شہباز خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''یہ تمہارے اَفیئرز تو نہیں ہیں کہ پہلے ملاقات ہوگی پھر ترقی ہوگی اور پھر زوال...''

فاروق زور سے ہنس دیا۔

''زندگی نام ہے زندہ دلی کا۔ مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں...''

اور شہباز خان نے پاس پڑا کشن اس پر دے مارا۔

''میں تمہیں مردہ دل لگتا ہوں''۔

''مغرب کی بات اور ہے مشرق میں کوئی کارنامہ کر کے دکھاؤ''۔

''یہ کارنامہ دکھایا ہے نا''۔

تفصیل بتاؤ تو پتہ چلے کارنامہ ہے بھی یا یوں ہی...''

''چیلنج کرتے ہو''۔

''یہی سمجھو''۔

''ہوں''۔۔۔ وہ جیسے یادداشت اکٹھی کرنے لگا۔''مجھے معلوم ہوا وہ دن کے کوئی گیارہ بجے نیچے ریسٹورانٹ میں کوک آئس کریم وغیرہ کھانے جاتی ہے۔ٹھیک گیارہ بجے میں بھی کوفی پیتا ہوں۔سو بالکل اسی وقت میں بھی وہاں موجود ہوتا۔پھر میرا راستہ اسی کے سویٹ کے آگے سے گزرتا ہے۔اکثر مڈ بھیڑ ہو جاتی۔میں صبح ناشتہ اپنے برآمدے میں کرتا ہوں مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنے بیڈروم کی کھڑکی میں سے دیکھ رہی ہوتی ہے اور...''

''شہباز۔مجھے یہ سب نہیں۔یہ بتاؤ کیا کیا گپ شپ ہوئی،عہد و پیمان وغیرہ وغیرہ''۔

شہباز خان اس کی بے صبری پر مسکرا دیا۔میز پر رکھے قیمتی برینڈ کے سگریٹ کے ڈبے میں سے سگریٹ نکالا،لائٹر سے سلگایا اور کش لیتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔

''میری آج تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی''۔

''کیا؟''فاروق ہڑبڑا سا گیا۔

''ہاں''۔اسکی دلنشیں آنکھیں اس پر جمی تھیں۔

''تو پھر؟''وہ مایوس سا بولا۔

''میں نے واقعی اس سے کبھی بھی ایک بات بھی نہیں کی۔بس...''

''بس کیا؟''

''وہ چھوٹی سی ہے،پر آنکھوں کی زبان سمجھ لیتی ہے''۔

''واہ۔۔۔خوش کر دیا''۔

اور۔۔۔فاروق پھر متوجہ ہو گیا۔

''کبھی ریسٹورانٹ میں کبھی آتی جاتی پگڈنڈیوں پر،کبھی نیچے پارک میں تو کبھی یہیں

اپنے سویٹ کے آس پاس۔میں اسے اپنا پیغام پہنچا دیتا تھا''۔

''کیسے یار؟''وہ شاید صاف صاف سننا چاہتا تھا۔

''آنکھوں ہی آنکھوں میں یار''۔

''تو یوں کہو نا''۔

''میں اسکا بھی ردعمل پڑھ لیتا تھا۔اسکی گرتی اٹھتی پلکوں سے،چہرے پر چھائی لالی سے،لرزتے کانپتے ہونٹوں سے...''۔

''واہ۔داد دیتا ہوں۔نہ ادھر سے بات ہوئی نہ ادھر سے اور محبت ہو گئی''۔

''مجھے نہیں۔۔۔اسے ہو گئی''۔

''کیا پتہ...''

''پتہ ہے مجھے۔میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں۔جس دن مجھے یقین ہو گیا وہ پھنس چکی ہے پوری طرح۔میں نے راستہ بدل لیا۔اب میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔وہ بے چین ہے بے قرار ہے،اداس ہے افسردہ ہے۔میں محسوس کرتا ہوں اور مجھے سکون ملتا ہے۔خوشی ہوتی ہے۔اسے دکھی دیکھ کر مجھے اپنی فتح کا احساس ہوتا ہے۔میں جیت گیا ہوں وہ ہار گئی ہے...''۔وہ آہستہ آہستہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔''اور پھر یہ کیا دکھ ہے۔ہونہہ۔۔۔یہ بھی کوئی دکھ ہے۔دکھ تو مجھے ہوا تھا۔میں تو چور چور ہو گیا تھا،ریزہ ریزہ،بکھر گیا تھا...''۔

اس کے لہجے میں پھر سے دکھ اتر آیا تھا،کرب سوا ہو گیا تھا۔

کاش!سچ مچ اسے سکون مل جاتا!فاروق نے دکھ سے سوچا۔

پرلی طرف پہاڑی پر بنے پرانے چرچ کے کلاک نے صبح کے دو بجائے تو وہ اٹھا۔

''شہباز۔اب سونا چاہیے۔صبح چھ بجے روانہ بھی ہونا ہے یہاں سے''۔

''ہاں''۔وہ بھی اٹھنے لگا۔

''اور تمہیں معلوم ہے کوفی اور سگریٹ دونوں تمہیں ڈاکٹر نے منع کر رکھے تھے''۔

''ہاں۔کوشش کر رہا ہوں کم کرنے کی''۔

وہ کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں آ گیا۔

کپڑے تبدیل کیئے۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی، ڈریسنگ ٹیبل کے چوڑے آئینے میں دیکھنے لگا۔ سرخ ڈورے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔

امریکہ میں "Farooq__what does Shahbaz mean?" انکی پڑھائی کے دوران اس کے اور فاروق کے ایک مشترکہ امیریکن دوست مارک نے ایک دفعہ فاروق سے پوچھا تھا۔

"The king eagle__it always sits on the highest peak, keeps its head upright. It has bold eyes and a keen sight." فاروق بہت فخریہ انداز میں بولا تھا۔

"Wow__the daring__and also his jet black eyes shine bold..." مارک انکی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔ مگر...

وہ شاہ تھا باز نہیں تھا___ اس نے تلخی سے سوچا کہ وہ جی تو رہا تھا مگر آنکھوں میں وہ بے باکی نہ رہی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی اور جو ایک باز کی خصوصیت تھی!

بے جان سے قدم اٹھاتا وہ واپس کمرے میں آیا تو فاروق بستر میں گھس چکا تھا۔

"دوائیاں لے لی ہیں؟" فاروق نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"لیتا ہوں ابھی"۔ اسکی آواز شکست خوردہ تھی۔

وہ پل پل مرتا تھا، پل پل جیتا تھا___ زندگی کتنی کٹھن ہو گئی تھی۔

اس نے گہری سانس لی___ آہ تھی جس میں، کراہ تھی!

اور___ فاروق نے آنکھیں موندتے ہوئے سوچا۔ یہ لڑکی کتنی سنگدل تھی، کتنی بے حس تھی اسکے ایک زہریلے جملے نے اس کے دوست کی ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

یہ دو دن دو راتیں شائی نے اور بھی اذیت میں گزاریں۔

وہ نظر آتا تھا تو بھی دکھی ہو جاتی تھی۔ کہ جن اپنائیت بھری نظروں سے، بولتی نشیلی آنکھوں سے اس نے اسے زندگی کی ایک نئی لذت سے آشنا کرایا تھا۔ انہی نظروں میں اب کچھ باقی نہ رہا تھا۔ کوری کوری لگتی تھیں، اجنبی اجنبی۔

اب نظر نہیں آتا تھا تو بھی دکھی ہو رہی تھی۔ کہ پیار کے درد کیساتھ اب جدائی کی کسک بھی شامل ہو گئی تھی۔

لیکن ساتھ میں جو دکھ سب سے واضح تھا وہ اسکے بغیر رہنے کا تھا!

اسے دیکھنے، پانے اور پھر اسکے متعلق سوچوں سے تو اسکے دن مسکرانے اور راتیں مہکنے لگی تھیں۔ اسے اب اندازہ ہو رہا تھا وہ تو جی لیتی تھی اسے دیکھ کر۔ اب کیا کرے گی؟ اسکے بغیر جینے کا تصور بھی اسے مشکل لگ رہا تھا۔

شام پانچ بجے کے قریب وہ اپنے برآمدے میں بیٹھی پھپھو کیساتھ چائے پی رہی تھی۔ نظریں شہباز خان کے سویٹ پر جمی تھیں۔ آج خلاف معمول گھوڑا اور سائیس بھی نہیں آئے تھے۔ منع کر دیا ہو گا شاید ملازموں نے۔

"بادل گھر آئے ہیں پل میں دیکھو بارش شروع ہو جائیگی"۔ پھپھو نے آسمان پر امڈ آتے بادلوں کو تکتے ہوئے اس کی محویت کو توڑا۔

اس نے بھی نظریں آسمان پر جما دیں۔

"شہباز خان پولو کھیلنے گیا ہے اپنے دوست کیساتھ۔ شاکر بتا رہا تھا۔ آج واپس آئیگا"۔ پھپھو پھر بولیں۔

آج واپس آجائیگا۔لمحہ بھر کی خوشی کی جگہ گہری اداسی نے لے لی۔وہ آتو جائیگا مگر۔اسکی سپاٹ نظریں وہ کیسے سہہ پائیگی؟

"شاکر کہتا تھا شہباز خان کو کونجوں کے شکار کا بہت شوق ہے۔آنیوالی سردیوں میں پروگرام ہے۔کئی لوگ ساتھ جائینگے، خیموں میں رہینگے اور شکار کرینگے۔تمہارے دادا بھی خدا مغفرت کرے، بہت شوقین تھے شکار کے۔تمہارے پاپا کو ڈاکٹری لے ڈوبی۔نہ دن کا ہوش رہتا ہے نہ رات کا...." چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پھپھو نے خالی پیالی میز پر رکھ دی۔

شائی چپ چاپ انکی باتیں سنتی رہی۔

"لو وہ آگئے"۔پھپھو نیچے سڑک کے قریب بنے ہوٹیل کے ریسپشن کو تک رہی تھیں۔

رخ پیچھے موڑتے ہوئے اسکی نظریں بھی انکی نظروں کے تعاقب میں نیچے گئیں۔

شہباز خان آگے آگے اور اسکا دوست اسکے پیچھے۔۔۔۔ دونوں اوپر آتی پگڈنڈی پر ہو لئے تھے۔جیپ کے پاس اب بھی ملازم سامان اکٹھا کرنے میں لگے تھے۔

شہباز خان نے کالی پینٹ اور آف وائیٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔گھنے بال گرد آلود تھے ،شیو قدرے بڑھی ہوئی۔۔۔۔ وہ اور بھی زیادہ Manly اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔

وہ دونوں قریب تر آرہے تھے۔اس نے سوچا اٹھ کر اندر چلی جائے لیکن۔۔۔۔ ٹانگوں میں سکت ہی نہ رہی۔

شہباز خان کے دوست نے ایک غلط انداز نظر انکی طرف ڈالی تھی مگر۔۔۔۔

شہباز خان حسب سابق سپاٹ چہرہ لئے آگے بڑھ گیا تھا۔

اسکی بے حسی اسکے ننھے سے دل میں اترتے ہوئے اسے لہولہان کر گئی۔باوجود کوشش ضبط کے اسکی خوبصورت بڑی بڑی کاسنی مائیل آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

کرسی سے اٹھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔کہیں پھپھو دیکھ لیتیں تو؟

"پھپھو میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔پارک چلتے ہیں پھر"۔وہ رخ انکی طرف کئے بغیر بمشکل بولی۔

"بیٹا بارش کی آمد آمد ہے...."

"کچھ نہیں ہوتا۔" وہ اندر چلی آئی۔

ہر سو سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، بجلیاں تڑپ رہی تھیں، آسمان گرج رہا تھا۔

اور۔۔۔۔ جل تھل بارش ہو رہی تھی۔

شہباز خان اور فاروق نہا دھو کر اپنے سویٹ کے لونگ روم میں آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔درمیانی میز پر چیز سینڈوچز، ہنٹر بیف اور بادام کا کیک رکھے ہوئے تھے۔ایک طرف دونوں کے بالکل قریب چھوٹی میز پر کرسٹل کی خوبصورت ٹرے میں ڈھیر سارا ڈرائے فروٹ رکھا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کے بیرے نے آکر میز پر چائے لگائی اور خالی ٹرے لئے مؤدب طریق سے واپس مڑتا باہر نکل گیا۔

شہباز خان نے گھڑی پر نگاہ کی۔پونے سات بج رہے تھے۔انہیں واپس پہنچے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے چائے دانی اٹھائی، پہلے فاروق کے کپ چائے میں ڈالی اور پھر اپنے کپ میں ڈالنے لگا۔

ایک نظر فاروق پر ڈالی۔وہ خاموشی سے سینڈوچ کھانے میں مصروف تھا۔

آدھا چمچ چینی اپنی چائے میں ملاتے ہوئے اس نے کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

"کیا حسن پایا ہے یار۔میں تو قائیل ہو گیا"۔فاروق آہستہ سے گویا ہوا۔

"کس کی بات کر رہے ہو"۔

"تمہاری پڑوسن کی"۔

اور۔۔۔۔ شہباز خان نے خاموشی سے نظریں اپنے کپ پر جمادیں۔

"غضب کے نقش ہیں... اور پرپلش آنکھیں تو قیامت ڈھاتی ہیں... سیاہ لمبی

پلکیں...'

شہباز خان اب بھی کچھ نہیں بولا۔

''تمہارا قصور نہیں تھا۔اسے دیکھ کر تو کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے...'' وہ مزید بولا۔

شہباز خان کچھ اَن ایزی سا لگنے لگا۔

اور___ فاروق کو احساس ہوا یوں اسکا ذکر کر کے وہ شہباز خان کو پریشان کر رہا تھا۔

مانا کہ وہ بے پناہ خوبصورت تھی۔خوبصورتی کیساتھ ساتھ بلا کی معصومیت پائی تھی اور___ یہ سب ملا کر اس نے تو بہ شکن حسن پایا تھا مگر___

شہباز خان کو اس نے بہت اذیت دی تھی۔اسکا ذہنی توازن ڈگمگا گیا تھا۔اسکی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

پچھلے دنوں وہ کن کن مراحل سے گزر رہا تھا اور اب بھی کون سا نارمل تھا!

دفعتاً اسے خیال آیا___ شہباز خان یہ کیا کھیل کھیل رہا تھا؟ صبح شام شائی کی اسکی نظروں کے سامنے موجودگی اسے ایک بار پھر اس مقام پر لا کھڑا کر سکتی تھی!

''شہباز یہاں سے واپسی کا کب پروگرام ہے؟'' اسکا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔

''ہوں''۔وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''واپس کب جانا ہے؟'' وہ سنجیدہ ماحول کو خوشگوار بنانے کی خاطر مسکراتے ہوئے دوبارہ بولا۔

''ابھی نہیں''۔

''پھر کب؟''

''چلا جاؤں گا''۔

اسکی ٹال مٹول شاید اس لڑکی کو ابھی مزید پریشان کرنا تھا۔

مگر___ ساتھ ہی اسکی قربت سے اسکے ڈپریشن میں جانے کا بھی خطرہ تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

''جلدی آنا۔میں بھی اکیلا محسوس کرتا ہوں''۔

''ابھی نہیں قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے وہاں''۔اس بار وہ حقیقت سے کام لے رہا تھا۔

پولو کیلئے جاتے، آتے وہ میدانی علاقے سے گزرے تھے تو اندازہ ہوا تھا، یہاں تو وہ جنت میں رہ رہا تھا۔

''میں بھی تو ہوں وہاں''۔فاروق نے مسمسی سی شکل بنائی۔

''آل رائیٹ آل رائیٹ۔بس یہ ایک مہینہ۔''

اور فاروق خاموش ہو رہا۔زیادہ زور بھی تو نہیں دے سکتا تھا۔ڈاکٹرز نے اسکا بہت خیال رکھنے کو بھی تو کہا تھا پر___

ایک بات صاف تھی۔اس نے اس لڑکی کو اور خود کو، دونوں کو خراب کرنا تھا! بہر حال۔

''ویسے نانو کو پتہ چلا کہ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو تو؟''

''تم انہیں نہیں بتاؤ گے''۔وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

فاروق ہنس دیا۔

''او کے۔نہیں بتاؤں نگا۔ایک کپ گرم چائے بناؤ میرے لئے''۔موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنی ٹھنڈی پڑی چائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وقت پر کیوں نہیں پی۔نہیں بناؤں نگا''۔

''نانو کو سب بتا دونگا''۔اس نے دھمکی دی۔

''دیکھو___ مذاق میں بھی ایسا مت کرنا۔نانو پریشان ہو جائینگی''۔

''تو بناؤ چائے''___اس نے اپنی ٹھنڈی چائے قریب پڑے گلاس میں انڈیل دی۔

''بناتا ہوں''___وہ جھنجھلایا جھنجھلایا اس کیلئے چائے بنانے لگا۔

رات ڈنر کے بعد بھی وہ دیر تک گپ شپ کرتے رہے لیکن ___

فاروق نے پھر شائی کا ذکر نہیں چھیڑا۔اسکی بہر حال کوشش تھی کہ شہباز خان کو اس تمام معاملے سے باز رکھ سکے۔

شہباز خان حسب معمول نیچے ریسٹورانٹ میں کوفی پینے گیا تھا۔

شائی آج بھی وہاں نہیں گئی۔ اب اسکا سامنا کرتے ہوئے اسے اچھا نہیں لگتا تھا بلکہ۔ کچھ شرمندگی سی ہوتی تھی، ندامت سی۔ کہ اسے تو اسکی پرواہ نہیں تھی اور وہ تھی کہ اس کیلیے مری جا رہی تھی۔

آج وہ حسب معمول برآمدے میں بھی نہیں بیٹھی۔ پھپھو کو ساتھ لے کر کچن کے پچھلے دروازے کے آگے کھلی جگہ میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ رہی تھی۔

یہاں سے نیچے بل کھاتی سڑک، ہوٹل کا ریسپشن اور ریسٹورانٹ صاف نظر آتے تھے۔ نہیں نظر آتا تھا تو بس شہباز خان کا سویٹ!

نیلگوں آکاش شفاف تھا، قدآور درخت دھلے دھلے اور ہری بھری نرم نرم گھاس میں یہاں وہاں سر اٹھائے سفید ڈیزیز کے پھول کھلے کھلے!

تبھی انکے سویٹ کے دروازے پر دستک سے وہ چونکی۔۔۔ رخ موڑ کر کچن کی طرف دیکھنے لگی اور ساتھ ہی صاحبو کاکا کی ہمراہی میں کچن کے دروازے سے نادیہ برآمد ہوئی۔

نادیہ اسکی فرسٹ کزن تھی، ماموں کی بیٹی تھی۔ جینز اور بلاؤز پر جیکٹ پہنے، کندھوں تک کھلے بال ڈائے کئے اچھی لگ رہی تھی۔

''ہیلو نادیہ''۔ شائی خوش ہو کر اٹھتے ہوئے اسکے گلے لگ گئی۔

اور پھپھو نے دونوں کا موازنہ کیا۔ کہنے کو تو فرسٹ کزنز تھیں مگر زمین آسمان کا فرق تھا دونوں میں۔ شائی جتنی شیریں زبان، ٹھنڈے مزاج کی اور ہر دلعزیز تھی۔ نادیہ اتنی ہی تیز، بدتمیز اور آزاد خیال تھی۔ شائی کا جہاں اس کیلیے دل میں خلوص تھا وہاں نادیہ من ہی من میں

شائی سے جلتی تھی۔ مرتبہ اور حیثیت میں گو شائی سے کم نہ تھی، بریگیڈیئر تھا باپ۔ مگر عادات واطوار، معصومیت اور خوبصورتی میں شائی سے مار کھا گئی تھی۔ اور یہی شاید اصل وجہ تھی اسکے حسد کی۔

شائی کے بے پناہ حسن اور سیرت کا جہاں دور تک چرچا تھا۔ نادیہ کی آزاد خیالی اسکے اتنی ہی آڑے آ رہی تھی۔ نقوش اسکے بھی کوئی ایسے برے نہ تھے اور میک اپ کر کے تو اچھی خاصی ہو جاتی تھی مگر تکبر، بدزبانی اور حد درجہ آزادی اسکی شہرت کو مسخ کئے دیتے تھے۔ شائی سے عمر میں چار پانچ سال بڑی تھی۔ مگر جہاں اب تک شائی کے کئی رشتے آ چکے تھے وہاں نادیہ کو اب تک کسی نے اس لحاظ سے نہیں پوچھا تھا۔ شائی سے جیلسی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

دونوں کی عمر میں فرق کیساتھ ساتھ دونوں کی سوچ میں بھی بڑا فرق تھا۔ شائی جہاں باپ، پھپھو اور گھر کو ہی اپنی جنت سمجھتی تھی۔ نادیہ وہاں اس قسم کی زندگی پر لعنت بھیجتی تھی۔ وہ کلب، شور شرابے اور کئی کئی بوائے فرینڈز کی رفاقت کو ہی اصل زندگی سمجھتی تھی۔

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے وہ شاذ ہی شائی کو ملنے آتی۔ مگر شائی کو بھائی بہن کی محرومی کا احساس گاہے گاہے نادیہ سے ملنے پر ضرور مجبور کرتا۔

آج بھی پتہ نہیں کیسے اسے اپنی مصروفیات سے فرصت ملی تھی اور کیسے شائی کی یاد آ گئی تھی۔

صاحبو تیسری کرسی بھی لے آیا تھا۔ تینوں بیٹھ گئیں۔

''نادیہ بیٹی ٹھیک تو ہو نا۔ امی ابو کیسے ہیں؟'' پھپھو احوال پرسی کرنے لگیں۔

''ٹھیک ہیں''۔ وہ مختصراً بولی۔ کہ

پھپھو کو وہ اس گھر کی ایک ملازمہ ہی سمجھتی تھی اور بس۔ بقول اسکے انکل اور شائی نے انہیں خواہ مخواہ سر چڑھا رکھا تھا۔

''مامی بھی آئی ہیں یا فرینڈز کیساتھ آئی ہیں آپ''۔ شائی نے پوچھا۔

وہ اکثر اوقات اپنی دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر بے تکلف نکل جاتی تھی۔۔۔ خاصی بولڈ

تھی۔

''نہیں۔۔۔ مام ساتھ ہیں۔ ناصر اور سلیم بھی آئے ہیں۔ نیچے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ دو تین دن رہیں گے۔ انکل سے تمہارے یہاں ہونے کا پتہ چلا تھا سوچا مل آؤں''۔

''بہت اچھا کیا آپ نے۔ ویسے آپ میرے پاس ہی رہ جائیں۔ گپ شپ کرینگے''۔

شائی کے من میں چھائی اداسی گھٹنے لگی تھی۔

''اس وقت تو ذرا جلدی میں ہوں۔ بعد میں سوچیں گے''۔

''اے نہیں بیٹا اتنی جلدی کیسے جاؤ گی۔ صاجبو...'' انہوں نے قریب ہی کچن میں صاجبو کو آواز دی۔ ''چائے بناؤ ذرا نادیہ بی بی کیلئے۔ پکوڑے بھی تل لو جلدی سے''۔

''اسکی ضرورت نہیں۔ بس میں شائی سے چند باتیں کر کے جا رہی ہوں''۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے نادیہ۔ آرام سے بیٹھیں''۔ شائی نے کہا۔

''اس وقت نہیں۔ پھر کبھی سہی''۔

شائی چپ ہو رہی۔

پھپھو اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ کزنز تھیں، اپنی باتیں کر لیتیں تو بہتر تھا گو۔۔۔ یہ دھڑکا انہیں ضرور لگا رہتا کہ کہیں نادیہ اسے بھی اپنی طرح آزاد نہ بنا لے۔

''اچھا سناؤ کیا حال چال ہیں۔ ایگزامز کیسے ہوئے''۔ نادیہ کندھے سے لٹکا بیگ کرسی کے قریب گھاس پر رکھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ٹھاک''۔

''کب سے یہاں ہو''۔

''کوئی دو ڈھائی ہفتے تو ہو گئے ہیں''۔

''یہاں کتنا اچھا موسم ہے نا''۔

''لیکن میں اب بور ہونے لگی تھی''۔ شہباز خان کی سرد مہری کی وجہ سے یہاں کا موسم اب اسے ماند لگنے لگا تھا۔

''اکیلی ہو نا''۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

''واؤ۔۔۔ واٹ اے ہینڈسم مین!'' نیچے ریسٹورانٹ سے آتی پگڈنڈی پر نگاہ ڈالتے ہی وہ بے اختیار بول اٹھی۔

غیر ارادی طور پر شائی بھی رخ پھیر کر اس طرف دیکھنے لگی۔

شہباز خان تھا۔ ریسٹورانٹ سے واپس اوپر سویٹ کی طرف آ رہا تھا۔

لائیٹ گرے سوٹ میں ملبوس واقعی بہت سمیشنگ لگ رہا تھا۔

شائی نے خاموشی سے رخ واپس پھیر لیا۔

''ایسے ایسے لوگ موجود ہیں یہاں اور تم بور ہو رہی ہو''۔ وہ اسی پر نظریں جمائے تھی۔

شائی چپ رہی۔

''کون ہے یہ؟'' وہ انکے سویٹ کی اوٹ میں چلا گیا تو نادیہ نے شائی سے پوچھا۔

''قریب کے سویٹ میں رہتا ہے''۔ شائی نے کہا۔

''یہاں تمہارے سویٹ کے پاس''۔ اس کا متجسس لہجہ اشتیاق لئے تھا۔

''ہاں''۔

''پھر تو ملاقات رہتی ہوگی''۔

''کیا مطلب؟''

''پڑوسی ہے نا۔ ملی تو ہو گی''۔

''نہیں۔ کبھی ایسا موقعہ نہیں آیا''۔

''کتنی بور ہو۔ پڑوسیوں سے تو ملا کرو۔ اور پڑوسی بھی اتنا گرینڈ''۔ وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

شائی صرف مسکرا دی۔

''کون ہے ویسے؟'' وہ پھر بولی۔

''کوئی انڈسٹریلسٹ ہے۔ شہباز خان نام ہے''۔

"اوہ"۔۔۔ وہ کچھ چونک سی گئی۔ پھر جلدی ہی سنبھل گئی۔

"بڑا آدمی ہے ہاں۔۔۔ کبھی ملواؤ نا"۔

شائی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں۔۔۔ میں کیسے ملواؤں"۔

"یکدم بیوقوف ہو۔ چلو چل کر کچھ کھاتے پیتے ہیں"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں واپس جائینگی"۔

"اب چلو بھی۔ تھوڑا گھوم پھر آئینگے"۔

"اچھا ایک منٹ میں ذرا جوگرز پہن لوں"۔

"چلو"۔

شائی کچن سے اندر جانے لگی تو وہ بھی ساتھ ہولی۔

"پھپھو، ہم ذرا گھوم پھر کر آتے ہیں"۔ شائی نے کچن میں بیٹھیں پھپھو سے کہا۔

"اچھا بیٹی۔ پر جلدی آنا۔ نادیہ کو بھی ساتھ لیکر آنا"۔

"اچھا پھپھو"۔

اور وہ دونوں اسکے بیڈروم میں آگئیں۔

وہیں کھڑکی کے اس طرف شہباز خان اور اسکا دوست اپنے برآمدے میں کھڑے تھے۔

"تم جیسا سست آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا"۔ شہباز خان کہہ رہا تھا۔

"اور تم جیسا ڈسپلنڈ بھی کوئی خاص اچھا نہیں لگتا۔ چھٹیاں ہوتی ہیں آرام کیلئے خوب خوب سونے کیلئے۔ یہ نہیں کہ الارم لگا کر اٹھو، الارم لگا کر بیٹھو، الارم لگا کر ڈریس اپ ہو، الارم لگا کر کھاؤ پیو، الارم لگا کر سوؤ۔۔۔"

شہباز خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"میں نے کب الارم لگائے ہیں"۔

"ساری زندگی اتنے ڈسپلنڈ رہے ہو۔ یہی لگتا ہے الارم سے اٹھتے بیٹھتے ہو"۔

معاً شہباز خان کا پی اے موبائل فون لئے نمودار ہوا۔

"سر آپکا فون"۔

اور اس نے فون کان سے لگالیا۔

"بڑے ٹھاٹ باٹ ہیں"۔ نادیہ مرعوب سی بولی۔

"چلیں"۔ شائی جوگرز پہن چکی تھی۔

دونوں باہر نکل کر نیچے ریسٹورانٹ کی طرف چل دیں۔

شائی نے نادیہ کیلئے آئس کریم اور اپنے لئے کوک پر ہی اکتفا کیا کہ اسکا گلہ واقعی بہت خراب تھا، کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی۔

"کب سے ہے یہاں یہ؟" نادیہ کچھ سوچتے سوچتے بولی۔

"کون؟"

"یہی شہباز خان"۔

"اوہ۔۔۔ قریباً دو ہفتے سے"۔

"اور اب تک تم سے کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ کیوں؟" اسے ہنسی بھی آئی۔ وہ تو اس بات کے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔

"کچھ نہیں"۔ وہ ہنس دی۔ "ویسے اچھی شے ہے"۔ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

پتہ نہیں، کیوں شائی کو اسکا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ نادیہ پہلے بھی اس سے اپنے دو ایک بوائے فرینڈز ڈسکس کر چکی تھی۔ کوئی خود بہت ڈیشنگ تھا تو کسی کا انداز گفتگو Killing تھا۔

مگر شہباز خان کے متعلق ایسا سن کر جانے کیوں اسے اچھا نہیں لگا۔۔۔ پھر اسے خیال آیا وہ کون سا اسکی پرواہ کرتا تھا!

نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ایک گہری سانس لی۔

"ہے نا" اسے خاموش پا کر اس نے پھر کہا۔

''میں نے غور نہیں کیا''۔

''تم ابھی بچی ہو''۔اس نے بے باکی سے قہقہہ لگایا۔

''چھوڑیں۔کوئی اور بات کریں''۔اسے یہ ذکر تکلیف دینے لگا تھا۔

''ایسے جادوئی موسم میں،ایسی جادوئی جگہ پر،ایسے جادوگر لوگ ہوں تو کیا خاک دوسری بات ہو''۔

اور شائی کو لگا وہ جیسے یہی ذکر کرنے اسے یہاں لائی تھی۔ورنہ شہباز خان کو دیکھنے سے قبل تو وہ واپسی کی رٹ لگائے تھی۔

''مجھے لگتا ہے تمہارے پاس آنا ہی پڑیگا''۔

اور۔۔۔۔شائی کو اپنا دل بیٹھتا سا محسوس ہوا۔

گو اس سے پہلے خود اس نے ہی اسے اپنے یہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی مگر اب ۔۔۔۔ انجانے اندیشے سر اٹھانے لگے۔

پھر۔۔۔۔لمحوں میں ہی وہ اپنے آپکو ملامت کرنے لگی۔نادیہ کا تو فیشن تھا ایسی باتیں کرنے کا۔وہ شہباز خان کو اس سے چھیننے تھوڑی آرہی تھی۔

شہباز خان۔۔۔۔جس نے اسے آج تک اپنا کہنے کا حق نہیں دیا تھا!

''تم ایک کام کرو۔میرے ساتھ ہمارے ہوٹیل چلو۔مام سے بھی مل لوگی اور میرے لئے تمہارے پاس ٹھہرنے کی اجازت بھی لے دوگی''۔

''ٹھیک ہے''۔اور کہتی بھی کیا۔

شائی پے منت کرتی ہوئی نادیہ کیساتھ اسکے ہوٹیل چل پڑی۔

کچھ دیر وہیں ناصر اور سلیم سے گپ شپ کرتی رہی۔نادیہ کیلئے مامی سے اجازت بھی لے دی۔انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

''اچھا ہے تمہارے پاس رہ کر نادیہ زیادہ انجوائے کریگی''۔انہوں نے کہا۔

''اچھا۔چلوں پھر''۔

''میں شام چار بجے تک آجاؤنگی''۔نادیہ نے کہا۔

اور بوجھل سے قدم اٹھاتی وہ انکے کمرے سے باہر نکل آئی۔

ہوٹیل پہنچتے پہنچتے اسے دو بج گئے۔

سر جھکائے سوچوں میں گم اپنے برآمدے تک پہنچی تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی۔

نظریں اٹھا کر دیکھا۔

شہباز خان تھا۔اسکے سویٹ کے برآمدے کے آگے سے گزرتی پگڈنڈی پر نیچے جاتے جاتے یکدم ہی رک گیا تھا۔لنچ پر جارہا تھا غالباً۔۔۔۔اسے رکتے دیکھ کر اسکا دوست بھی اسکے پیچھے رک گیا تھا۔

اس وقت پھر اسکی نظریں بالکل سپاٹ تھیں،بے حس تھیں!

کیا تصور کیا تھا اس نے؟ کیوں وہ اتنا بے درد بن گیا تھا؟

معصوم سا دل تڑپا تو حسین آنکھیں گھائل ہوا تھیں۔کرچیاں ہوگئیں پر پلش کرسٹلز کی!

لانبی خمیدہ سیاہ پلکیں جھکاتے ہوئے اس نے گویا آنکھیں چھپا کر اپنی کمزوری چھپانا چاہی۔۔۔۔جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے برآمدے میں چلی گئی۔

چپکے سے بستر پر پڑ رہی تو۔۔۔۔باوجود کوشش ضبط کے خوبصورت آنکھیں چھلک پڑیں۔

''شائی بیٹے آؤ کھانے کو دیر ہورہی ہے''۔پھپھو کچن سے آواز دیتیں دروازے میں آنمودار ہوئیں۔

جلدی سے شائی نے آنکھیں تکیے سے رگڑ لیں۔سر اٹھا کر چور سی پھپھو کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ تم تو رو رہی ہو''۔پھپھو دھک سے رہ گئیں۔پاس آکر اسکا سر سینے سے لگالیا۔

اور وہ باقاعدہ رو دی۔پتہ نہیں کیوں اور ضبط نہ کرسکی۔

''کیا ہوا بیٹا بتاؤ تو''۔وہ حیران تھیں یہ اچانک کیا ہوگیا تھا اسے۔

مگر وہ روئے گئی۔اپنے آنسو نہ روک سکی۔

''نادیہ نے کچھ کہہ دیا؟'' پھپھو کو شبہ گزرا،پہلے بھی وہ کئی بار اپنی جلی کٹی باتوں سے اسے

رلا چکی تھی۔

''نن... نہیں۔'' اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

''پھر؟''

''کچھ نہیں پھپھو''۔ وہ انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھنے لگی۔ ''بس پاپا یاد آ گئے تھے''۔

پاپا کیلئے پہلے تو وہ کبھی ایسا نہیں روئی تھی۔ وہ حیران سی ہوئیں۔

''روتے نہیں بیٹا۔ چاہو تو گھر کا ایک چکر لگا لینگے۔ آج شام پاپا سے فون پر بات بھی کر لو۔ تسلی ہو جائیگی''۔

''اچھا۔'' وہ اٹھ کر باتھ روم چل دی۔

منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے بال درست کئے اور کمرے میں آ گئی۔

''چلیں پھپھو کھانا کھاتے ہیں''۔

''آؤ''۔

دونوں کھانا کھانے لگیں۔ پھپھو ادہر ادہر کی باتیں کر کے اس کا دھیان بٹانے لگیں۔ خود اس نے بھی اپنے اوپر قابو پا لیا۔ کیا ہو گیا تھا اسے؟ یوں اپنی کمزوری ظاہر کر گئی تھی۔

کھانے کے بعد بستر میں گھس کر اس نے سوچا۔ وہ اسکا خیال ذہن سے نکالنے کی کوشش کریگی۔ اس طرح ایک سائے کے پیچھے بھاگنا کہاں کی عقلمندی تھی؟

ٹھیک چار بجے نادیہ پہنچ گئی ـــــ بڑا سا بیگ بھی اٹھائے تھی۔

''آ گئیں بیٹا''۔ پھپھو باہر برآمدے میں ہی تھیں۔

''ہاں۔ اب تو رہوں گی دو تین دن یہاں''۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ مزاج کی تیزی بھی کہیں چھوڑ آئی تھی ورنہ پھپھو سے وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔

''بہت اچھی بات ہے بیٹا''۔

''شائی کہاں ہے؟''

''سو رہی ہے''۔

مگر ـــــ شائی دونوں کی باتوں کی آواز سے جاگ چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں بستر ہی میں گھسی رہی، اٹھی نہیں۔

''ٹھیک ہے اسے جگانا نہیں۔ میں تب تک ذرا ادہر ادہر گھوم پھر لونگی''۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے''۔ پھپھو شائی کو نیند سے جگانے کی کبھی بھی حق میں نہیں تھیں۔

نادیہ شاید گھومنے نکل گئی تھی۔ شائی یوں ہی آنکھیں موندے بستر میں پڑی رہی۔ پھر اکتا سی گئی، اٹھ کر باتھ روم گئی، منہ ہاتھ دھوئے۔ ڈریسنگ روم میں آ کر بال برش کرنے لگی۔ تو چونکی۔

''میں آپکی نیبر ہوں، نادیہ نام ہے میرا۔ شائستہ کی کزن ہوں، آج ہی آئی ہوں''۔

''I am Farooq, pleased to meet you.'' مردانہ آواز آئی تھی۔

شائی نے وہیں سے ایک نظر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی پر ڈالی۔

نادیہ تھی۔ شہباز خان کے دوست سے اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ وہ اوپر اپنے برآمدے میں کھڑا تھا اور نادیہ دو ہی قدم پر نیچے شائی کے بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

''آپ ـــــ کہاں سے آئے ہیں؟''

''بہت گرم جگہ سے''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اکیلے ہیں، میرا مطلب ہے کوئی اور...''۔

''میرا دوست بھی ہے۔ بلکہ میں اپنے دوست کے پاس آیا ہوں جیسے آپ اپنی کزن کے پاس آئی ہیں''۔

''اوہ''۔ نادیہ ادا سے مسکرائی۔ ''اچھا اب چلوں...''۔

نادیہ نے شہباز خان کے دوست پر یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس سے اتفاقاً ملی تھی۔ جبکہ شائی کو سو فیصد یقین تھا اسے برآمدے میں دیکھ کر وہ جان بوجھ کر ادہر سے گزری تھی۔ تاکہ جان پہچان کی ابتداء ہو سکے اور آگے چل کر شہباز خان سے ملنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

اسے اب بھی یہ سب اچھا نہیں لگا۔ برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ باہر برآمدے میں پھپھو کے پاس آبیٹھی۔

''نادیہ آگئی ہے''۔ پھپھو نے اطلاع دی۔

''پتہ ہے''۔ وہ کچھ بے دلی سے بولی۔

''گھومنے نکلی ہے ادھر ہی''۔

''ہاں دیکھ لیا ہے میں نے ... کھڑکی سے۔''

''جاؤ بلالو''۔

''آجائیگی خود ہی''۔

پھپھو نے ایک نظر اسے دیکھا۔ کیا بات تھی۔ شائی اسکی آمد پر ہمیشہ کی طرح خوش دکھائی نہ دیتی تھی۔

صاحبو چائے لاکر میز پر لگانے لگا۔ تو پھپھو خود اٹھ کر نادیہ کو بلانے چلی گئیں۔

قیمہ بھرے گرم گرم سموسوں کیساتھ چائے پیتیں وہ تینوں باتوں میں مصروف تھیں۔

تبھی شہباز خان کا سائیس مقررہ وقت پر گھوڑے لئے آپہنچا۔

''یہ کس لئے ہیں؟''۔ نادیہ نے پوچھا۔

''شہباز خان گھڑسواری کیلئے جاتا ہے اس وقت'' پھپھو نے کہا۔

وہ ایک بار پھر مرعوب نظر آنے لگی۔

''اور کیا کیا شوق پال رکھے ہیں اس انڈسٹریلسٹ نے''۔

''پولو کھیلتا ہے۔ شکار پر جاتا ہے اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا ہے''۔ پھپھو مزے سے بتانے لگیں۔

''واؤ...''۔ پھر وہ شائی کی طرف جھکی۔ ''ایسا کوئی مل جائے تو زندگی بن جائے''۔ اس نے اسکے کان کے پاس کہا۔ اور ــــ

شائی کو اپنا رنگ خود سفید پڑتا محسوس ہوا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شہباز خان اور فاروق نمودار ہوئے۔

گھوڑوں پر بیٹھے اور لمحوں میں ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''دوسرا بھی برا نہیں۔'' اس نے شائی کو دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں آنکھ دبائی۔ ''کیا خیال ہے''۔

سہیلیاں تو آپس میں گپ شپ کرتی ہی ہیں مگر اس وقت اسکا انداز کچھ اس قدر گھٹیا تھا کہ شائی کو کراہت سی آنے لگی۔

پھپھو بھی سب دیکھ اور سن رہی تھیں مگر ایسی پوزیشن میں تھیں کہ تنبیہہ نہ کرسکتی تھیں۔

''شائی بیٹا۔ پارک جائینگے۔ شمشاد بیگم میری راہ دیکھ رہی ہوگی''۔ کچھ نہ بن پڑا تو شمشاد بیگم کا سہارا لے لیا۔

اور پھر چائے پی لینے کے بعد تینوں نیچے پارک میں چلی گئیں۔

نادیہ نے جھولا جھولنے یا 'سی سا' کو قطعی احمقانہ حرکت قرار دیا۔ اور پھپھو اور شمشاد بیگم سے قدرے ہٹ کر سڑک کے کنارے ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

''میری گوراؤنڈ پر تو آجاؤ''۔ شائی نے اسے دعوت دی۔

''یہ بھی تم ہی کو مبارک ہو''۔ وہ کچھ جھنجھلائی سی بولی۔ چیز واقعی بچوں والی تھی، کم از کم نادیہ کے ٹیسٹ کی بالکل نہیں تھی۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی شائی کو ہنسی آگئی۔

''بس بس معلوم ہے تمہارے دانت خوبصورت ہیں''۔ اسکے لب و لہجے میں ہمیشہ کی طرح طنز گھل مل گیا تھا۔

عادت تھی اسکی، شائی نے سر جھٹکا اور 'میری گوراؤنڈ' پر جا بیٹھی۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کچھ فاصلے پر سڑک پر شہباز خان اور فاروق پیدل چلتے اس طرف آتے نظر آئے۔

بے اختیار شائی کی نظریں نادیہ پر گئیں۔

اور اسے حیرت ہوئی۔ نادیہ بڑی مہارت سے پتھر سے اٹھ کر اس جانب بڑھی۔ اسطرح کہ کوئی اس پر شک بھی نہ کر سکے، جیسے اس نے شہباز خان اور فاروق کو نہیں دیکھا تھا بلکہ اتفاقاً ہی سڑک کے قریب قریب گھاس پر چلتے چلتے اس طرف بڑھی تھی۔ پھر وہیں سڑک کے کنارے بڑے سے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر آس پاس نظریں دوڑانے لگی تھی۔

وہ دونوں قریب تر آرہے تھے۔ نادیہ انجان بنی ان کے راستے میں کھڑی تھی۔

''شہباز یہ ہماری نیبر ہیں مس نادیہ اپنی کزن کے پاس آکر ٹھہری ہیں''۔ فاروق اسے دیکھ کر رک گیا۔ شہباز خان کو بھی رکنا پڑا۔

''ہیلو''۔ نادیہ شہباز خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہیلو''۔ شہباز خان نے متانت سے کہا۔

پھر ـــ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''آپ لوگ رائیڈنگ پر نہیں گئے تھے؟'' نادیہ نے فاروق سے ہی پوچھا کہ شہباز خان متوجہ ہی نہیں تھا۔

''ہاں گئے تھے''۔ فاروق مسکرایا۔ ''مگر آگے لینڈ سلائیڈ آیا ہوا تھا۔ واپس آگئے۔ یہاں ہمیں کچھ کام تھا۔ بلکہ ـــ اسے وہاں''۔ اس نے پارک کے مخالف سمت اوپر پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک کوٹھی پسند آگئی ہے، اسے ہی دیکھنے جارہے ہیں۔ یہ کہتا تھا گاڑی میں چلتے ہیں۔ میں پیدل گھسیٹ لایا کہ صحت کیلئے پیدل چلنا بہت اچھا ہوتا ہے''۔

فاروق اپنی رو میں کہے جارہا تھا۔

''مجھے بھی پیدل چلنا اچھا لگتا ہے''۔ نادیہ بولی۔

''لیکن اس وقت اسکا موڈ بالکل نہیں تھا''۔ اس نے شہباز خان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپکے دوست کم ہی بولتے ہیں شاید''۔ نادیہ شہباز خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

شہباز خان کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ ابھری۔ بولا کچھ نہیں۔

''بہت کم۔ ساری کسر میرے ساتھ نکال لیتا ہے...''۔

''جبکہ اور بھی لوگ ہونگے جو سننے کو ترستے ہونگے''۔ ایک بار پھر وہ اسکی آنکھوں میں جھانکی۔

شہباز خان نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔ اور ـــ فاروق کو اسی لمحے کام یاد آگیا۔

''میں ذرا کیمسٹ کے پاس سے تھروٹ پینٹ لے کر آتا ہوں۔ تب تک یہ ضرور آپ سے باتیں کرلیگا''۔

شہباز خان کچھ ان ایزی سا لگنے لگا تھا۔

اور وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا چند گز کے فاصلے پر واقع چھوٹے سے بازار کی طرف چل دیا۔

''آپکا نام اور کام تو مجھے پتہ ہے میری کزن نے مجھے بتا دیا ہے۔ ایک نیبر ہونے کے ناطے آپ مجھے اور نہیں بتائیں گے اپنے متعلق''۔

اور اب شہباز خان سنبھل گیا تھا۔ چہرے پر خوشگوار تاثرات ابھر آئے تھے ـــ دل آویزی سے مسکرا رہا تھا۔ پر بولا اب بھی نہیں تھا!

''شاید آپ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے''۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے''۔ وہ پہلی بار گویا ہوا۔

اسکا دھیما، مدھر لہجہ۔ خمار آلود آواز اسے بہکانے لگی۔

''تو پھر کیا بات ہے''۔ وہ جلد سے جلد آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

''آپ ـــ پڑھتی ہیں''۔ اسے ابتداء کرنا ہی پڑی۔

اور پھر وہ اس سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

پرکشش لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی، دلنشیں آنکھوں میں چمک اور ـــ انداز میں کسی ساحر کا سحر!

شائی نے دیکھا نادیہ خوش لگ رہی تھی، بہت۔ اسکے سانولے رنگ پر مسرت کی دمک تھی۔

اور ـــ وہ بے چین سی ہو گئی۔ آہستہ سے 'میری گو راؤنڈ' سے اتر کر پھپھو کے پاس

آبیٹھی۔

اب اسکی انکی طرف پیٹھ تھی۔ وہ پھپھو سے باتیں کرنے لگی مگر کچھ سمجھ نہ پارہی تھی۔ نہ انکی بات، نہ اپنی!

بس شعلوں کی ایک لپک سی تھی جو اسکے تمام جسم میں سرایت کررہی تھی۔

وہ دونوں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ پہلے بھی وہ انکی باتیں سن رہی تھی اب بھی۔ اور ـــــ

اسے یقین تھا شہباز خان کو پہلے بھی اسکی موجودگی کا احساس تھا اور اب بھی۔

پہلے تو وہ انکی باتیں سمجھ رہی تھی پر اب ـــــ

اب اسے کچھ سمجھ نہ آرہی تھی۔

بس اتنا احساس تھا کہ وہ دونوں بول رہے تھے۔ اور نادیہ کیساتھ ساتھ اسکے بھی خوشگوار قہقہے بلند ہورہے تھے۔

جانے کب نادیہ آئی۔ کب وہ تینوں ہوٹیل کی طرف روانہ ہوئیں؟ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ تھا تو بس اتنا کہ ـــــ

نادیہ سرشار تھی، مسحور تھی، نشہ سا طاری تھا اس پر۔ شہباز خان کی دیومالائی شخصیت کا، سحر انگیز باتوں اور جادوئی انداز کا!

وہ سارا وقت اسی کی باتیں کرتی رہی۔ ٹی وی کے آگے بھی، ڈنر پر بھی اور رات گئے تک بھی۔

ایک بات اور بھی شائی نے محسوس کی۔ نادیہ اس کا ذکر فاتحانہ سے انداز میں کررہی تھی۔

جیسے کہہ رہی ہو تم جس سے بات تک نہ کرسکیں، میں نے اسے متوجہ بھی کرلیا ہے!

اور شائی سوچنے لگی ـــــ وہ پاگل ہوجائیگی۔

''بڑے فری ہورہے تھے پڑوسن کیساتھ''۔ رات گیارہ بجے فاروق گرم کوفی کا گھونٹ

بھرتا گویا ہوا۔

کہ ـــــ یہ انداز شہباز خان کے شان کی نفی کرتا تھا!

شہباز خان خوبصورتی سے ہنس دیا۔

''بڑی گپ شپ ہورہی تھی''۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ اب بھی اپنی کوفی سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے تھا۔

''ویسے۔ یہ ناانصافی ہے...''۔

''کیا مطلب؟'' وہ پہلی بار بولا۔

''دوپہر غور کیا تھا تم نے جب ہم نیچے ڈائننگ ہال میں لنچ کیلئے جارہے تھے...''

''کیا ہوا تھا؟''

''شائی سے مڈبھیڑ جو ہوئی تھی، کچھ غور کیا تھا تم نے؟''

شہباز خان نے غور کیا تھا۔ اسکی حسین آنکھیں گھائیل ہواٹھی تھیں، کرچیاں ہوگئی تھیں پرپلش کرسٹلز کی!

لانبی سیاہ خمیدہ پلکیں جھکاتے ہوئے اس نے گویا نم آنکھیں چھپا کر اپنی کمزوری چھپانا چاہی تھی مگر ـــــ

اسکے لبوں پر ایک فاتح مسکراہٹ ابھر آئی۔ بولا کچھ نہیں۔

''وہ بالکل رودینے کو تھی۔ اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن۔ یہ اسے تو معلوم نہیں نا کہ اسے کس بات کی سزا دی جارہی ہے۔ ایسے میں یہ سب اسکے ساتھ زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ پھر جب تم نیچے پارک کے پاس اسکی کزن کیساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کررہے تھے تمہیں معلوم ہے وہ کتنی بے چین لگ رہی تھی...''

''ہوگی''۔ خوبصورتی سے کندھے اچکاتا وہ لاپروائی سے بولا۔

''مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا''۔

''اوہ''۔

’اسلٹے میں کل جا رہا ہوں‘‘۔ اس نے احتجاج کیا۔

’’کل تم ویسے بھی جا رہے ہو کیونکہ پرسوں تم نے ڈیوٹی جوائین کرنی ہے۔۔۔‘‘

فاروق ہنس دیا۔

’’ویسے تم اب اسموکنگ کرنا چھوڑ دو۔‘‘

’’بڑا سائیڈ لے رہے ہو‘‘۔

’’وہ بہت معصوم ہے، چھوٹی ہے۔۔۔ یہ سب اس کی برداشت سے باہر دکھتا ہے‘‘۔

’’ہوں؟‘‘

فاروق کچھ سوچنے لگا۔

’’ایک کام کرو۔ تم اسکی کزن سے گپ شپ کرو میں۔۔۔ اسکا خیال رکھوں گا۔۔۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ زور سے چونکا، سیدھا ہو بیٹھا، کوفی کا مگ میز پر رکھ دیا۔

فاروق کو ہنسی آ گئی۔

’’اچھا چلو۔ میں اسکی کزن سے گپ لڑاؤں گا تم۔۔۔ اسے معاف کر دو‘‘۔

’’.Impossible‘‘ اسکا فیصلہ اٹل تھا!

اور فاروق نے گہری سانس لی۔

’’بڑے کنجوس ہو۔ دونوں میں سے ایک بھی Spare نہیں کر سکتے‘‘۔

شہباز خان کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

’’اسکی کزن سے تو میں اسے جیلس کرنے کیلئے باتیں کر رہا تھا۔ یہ تو بس اسے متوجہ دیکھ کر خیال آیا اسے جلاؤں تھوڑا سا‘‘۔

’’میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جناب۔ کہ یہ سب اس بچاری کو جلانے کیلئے ہو رہا ہے‘‘۔

’’بچاری، معصوم۔ اتنا سائیڈ کیوں لیتے ہو‘‘۔

’’وہ ہے ہی ایسی‘‘۔ اسکی معصومیت سے کسے انکار ہو سکتا تھا۔

’’کیا؟‘‘ وہ پھر چونکا۔

’’کچھ نہیں یار۔ بس تم چلو یہاں سے۔ خواہ مخواہ یہ بچاری لڑکیاں پریشان ہونگی۔ ایک کو تو پار لگا چکے ہو۔ دوسری کو۔۔۔‘‘

’’دیکھو۔ دوسری کا الزام مجھے مت دینا۔ خود پہل کی ہے اس نے۔ اور میں اگر اس سے بات کر رہا ہوں تو صرف پہلی والی کو جلانے کیلئے اور بس۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں‘‘۔

’’کیوں اس بچاری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو‘‘۔

’’بچاری۔۔۔ بچاری۔۔۔ پاگل کر دیا ہے تم نے۔۔۔‘‘

فاروق چونکا۔ شہباز خان یکدم ہی آپے سے باہر لگنے لگا تھا۔

وہ پچھتایا۔ باتوں ہی باتوں میں اسے خیال ہی نہیں رہا کہ شانی اسکی دکھتی رگ بھی تھی۔ خواہ مخواہ اسے اَپ سیٹ کر دیا تھا۔ اسے اسکی مہینہ ڈیڑھ پہلے ہوسپٹل میں حالت یاد آ گئی۔ کیا کر دیا تھا اس نے؟ وہ سخت نادم لگنے لگا۔

تھوڑی دیر خاموش رہا کہ کوئی بات ہی نہ بن پڑ رہی تھی۔

’’سوری شہباز۔ میں نے تمہیں اَپ سیٹ کر دیا ہے‘‘۔ وہ معذرت خواہ انداز میں بولا۔

شہباز خان بھی اپنے اوپر قابو پا چکا تھا۔

’’ایسی کوئی بات نہیں‘‘۔ اسکی آواز ڈوبی ڈوبی سی تھی۔ ’’میں۔۔۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا‘‘۔

’’شہباز‘‘۔

’’ہوں‘‘۔

’’واپس چلو‘‘۔ اسے پھر خدشے گھیرنے لگے تھے۔ آج پھر اسے واپسی کا مشورہ دینے لگا۔

وہ مسکرا دیا۔ ہولے سے۔ سمجھ گیا وہ اس کیلئے پریشان ہو گیا تھا۔

’’.You don't worry میں آ جاؤنگا‘‘۔

فاروق نے یہ نہیں پوچھا کہ کب؟ اسے معلوم تھا وہ گرمی کا ایک مہینہ گزار کر ہی آئیگا۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنی ضد کا بہت پکا تھا۔ اس لڑکی کو تنگ کرنے سے بھی باز نہیں آئیگا اور نتیجتاً خود کو بھی نقصان پہنچائیگا مگر۔ اس سے زیادہ وہ اور اسے فورس نہیں کر سکتا تھا۔

عجب شیشے کا بن گیا تھا۔ اِسطرح بھی ٹوٹنے کا خوف اُسطرح بھی چور ہونے کا خدشہ!

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ بابا اندر آ گئے۔ شہباز خان کیلئے گرم دودھ کا گلاس لئے۔

''بابا اسے دودھ مت دیں۔ نہ یہ کوفی چھوڑتا ہے نہ سگریٹ۔ آپ خواہ مخواہ میں زحمت کرتے ہیں۔'' فاروق نے بابا سے اسکی شکایت کردی۔

''سگریٹ کب پی ہے۔ تین دن سے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ بابا یہ جھوٹ بول رہا ہے''۔ وہ بچوں کی طرح صفائی دینے لگا۔

''کوفی بھی چھوڑ دیں بیٹا''۔ بابا نے گلاس میز پر اسکے سامنے رکھ دیا۔

''چھوڑ دی بابا''۔ اس نے کوفی کا خالی مگ میز پر رکھا۔ ''آئندہ نہیں پیوں گا''۔

بابا شفقت سے مسکرا دیئے۔

''دودھ پی کر سو جائیں۔ فاروق بیٹے نے بھی سویرے جانا ہے۔ آنکھ نہیں کھلے گی پھر''۔

''جیسا حکم بابا''۔ شہباز خان بولا۔

اور پھر ــــ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ واقعی سونے کیلئے بستروں میں گھس گئے۔

قدرت کا قانون اٹل ہے۔ دن کو اگر رات کی سیاہی میں ڈھال لیتا ہے، تو رات کو دن کے اجالوں میں پروتا ہوا لے آتا ہے۔

کھڑکی میں سے دھوپ کی سنہری کرنیں اسکے کمرے میں پڑیں تو اسکی آنکھیں کھل گئیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی پر نگاہ کی، نو بج رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

شہباز خان اپنے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اسکے آگے میز پر ناشتہ لگا تھا اور وہ گھونٹ گھونٹ کر کے اورنج جوس پیتا حسب معمول اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

ایک پل کو اسکی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں مگر دوسرے ہی لمحے اداسی نے آلیا۔ اسے ایک عام انسان کی چیز سمجھ لینے کے بعد اب وہ نادیہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

بے دلی سے اٹھتے ہوئے وہ باتھ روم کی طرف چل دی۔ نادیہ وہیں ڈریسنگ روم میں سو رہی تھی۔ رات اس نے کہا بھی تھا اسے اپنے کمرے میں سونے کو مگر بقول اسکے وہ پرائیویسی چاہتی تھی ــــ اس نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا تھا۔

نہانے کے بعد اس نے سفید اور مسٹرڈ چیک کے گرم کپڑے پہنے، مسٹرڈ نرم سی سویٹر پہنی، بالوں پر برش کیا اور مسٹرڈ لیدر کے شوز پہنتی کمرے سے نکل آئی۔ یہاں وہاں دیکھا پھپھو نظر نہ آئیں۔ کچن گئی۔ وہیں پچھواڑے سنہری دھوپ میں میز کرسیاں لگائے وہ ایک ہاتھ میں اخبار دوسرے میں تسبیح لئے انکی منتظر بیٹھی تھیں۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ پھپھو اس کی ہر خواہش کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ کل اس نے یہاں بیٹھنے کو کہا تھا، آج وہ پہلے سے بندوبست کئے بیٹھی تھیں۔ پھپھو کیلئے اسکی عقیدت میں

اور بھی اضافہ ہو گیا۔

''صبح بخیر پھپھو''۔انکے پاس آتے ہوئے وہ انکی قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''صبح بخیر''۔انہوں نے اخبار تہہ کرتے ہوئے ایک طرف رکھ دیا۔

''پھپھو یہ جگہ برآمدے سے زیادہ اچھی نہیں؟'' وہ اطراف پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

اونچائی پر واقع انکا سویٹ یہاں آخری سویٹ تھا۔باقی سب انکے سویٹ سے اوپر تھے۔ نیچے دور تک، گھاس ہی گھاس، ادھر ادھر پائینز کے درخت، انکے سویٹ کے پاس سے ہوتی نیچے تک بل کھاتی پگڈنڈی اور پھر نیچے سڑک کے قریب ہوٹل کا ریسپشن، ریسٹورانٹ وغیرہ تھے۔کافی نیچے سیاہ خمیدہ سڑک پر اکادکا ٹریفک بھی آجا رہی تھی۔

''بالکل زیادہ اچھی ہے۔میرے بیٹے کو ایک جگہ پسند ہوگی اور وہ اچھی نہ ہوگی''۔

انہوں نے تسبیح کا ورد بھی پورا کرلیا۔اخبار پر احتیاط سے تسبیح رکھ دی۔

''صاحبو ہمارے لئے ناشتہ بنا رہے ہو نا''۔انہوں نے وہیں سے صاحبو کو آواز دی۔

''ہاں آپا۔بس تیار ہی ہے''۔

''آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟'' اسے جاگنے میں دیر ہو جاتی تھی تو وہ کرلیا کرتی تھیں ناشتہ۔

''نہیں۔سوچا آج تم لوگوں کیساتھ کرونگی مگر۔نادیہ نہیں آئی۔سو رہی ہے کیا؟''

''ہاں''۔اس نے مختصراً کہا۔

''کافی دیر ہے جا کر جگا لاؤ''۔

''آجائیگی خود ہی''۔

پھپھو ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔اس دفعہ کیا بات تھی۔شائی کے لب و لہجے میں اس کیلئے پہلے والی گرم جوشی نہیں تھی۔اول تو وہ آتی ہی بہت کم تھی۔اور تب شائی کتنی خوش ہوا کرتی تھی اسے اپنے یہاں دیکھ کر۔اب وہ دو تین دن کیلئے آئی تھی پھر بھی شائی خوش ہونے کی بجائے پژمردہ سی مایوس سی دکھائی دے رہی تھی۔کیوں تھا ایسا؟

اور جانے کیوں شائی کو لگ رہا تھا نادیہ اسکے پاس ٹھہرنے نہیں، شہباز خان سے بات

بڑھانے آئی تھی۔اُس سے اسے چھیننے آئی تھی۔شہباز خان کو۔۔۔جو پہلے ہی اسکے ہاتھوں سے پھسلا جا رہا تھا!

''کوئی ان بن تو نہیں ہو گئی نادیہ سے؟''۔اس وقت پھر انہوں نے پوچھ لیا۔

کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا۔ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات تھی۔شائی کا رشتہ لینے کچھ لوگ آئے تھے۔لڑکا باہر سے ڈاکٹری پڑھ کر آیا تھا۔ہر لحاظ سے اچھا تھا۔خاندانی بھی تھا۔مگر شائی کے پاپا نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ شائی ابھی چھوٹی ہے وہ اسے مزید پڑھانا چاہتے ہیں۔

خیر۔۔۔انہی دنوں وہ شائی کیساتھ نادیہ کے یہاں گئیں۔باتوں باتوں میں پھپھو نے یہ بات نادیہ کو بتادی۔وہ بھی اس خیال سے کہ شائی کے پاپا کو اچھا رشتہ لوٹانا نہیں چاہیئے تھا۔

''واہ واہ بڑی ڈیمانڈ ہے''۔اپنی الماری میں کچھ دیکھتے ہوئے وہ اچانک بڑے طنز سے بولی۔

شائی خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اتنی خوبصورت بھی نہیں ہو کہ لوگ رشتے لے لے کر آئیں''۔وہ اپنی جیلسی چھپا نہ سکی، مزید بولی۔

پھپھو نے شائی کی طرف دیکھا۔وہ اب بھی چپ تھی مگر کچھ خفیف سی تھی، خجل سی تھی۔

''سفید رنگ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا''۔وہ رخ شائی کی طرف کرتے ہوئے ایک بار اور بولی۔

آج جانے کیا بات تھی، کچھ زیادہ ہی خار کھائے بیٹھی تھی۔

شائی خاموشی سے اسے تک رہی تھی جیسے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

''اے بیٹی یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔مجھے تو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ میری بچی کو کوئی نظر نہ لگا دے اور تم کہہ رہی ہو کہ خوبصورت نہیں ہے''۔پھپھو سے شائی کی بے چارگی اور نہ دیکھی گئی۔

''تم چپ رہو پھپھو۔۔۔میں تم سے بات نہیں کر رہی''۔اس نے پھپھو کو جھڑک دیا۔

پھپھو خاموش ہو رہیں۔

اور نادیہ ماتھے پر کئی بل لئے تیار ہوتے ہوئے ریکٹ ہاتھ میں لے کر بغیر کچھ کہے کلب میں ٹینس کھیلنے چل دی۔

شائی دنوں بعد اتنے شوق سے اسے ملنے گئی تھی۔ مگر وہ انہیں یوں ہی چھوڑ چل پڑی تھی۔

شائی کی مامی بھی گھر پر نہیں تھیں۔ وہ دونوں یوں ہی شرمندہ سی واپس گھر لوٹ آئیں تھیں۔

اسکے بعد شائی کافی دن اسکے یہاں نہیں گئی۔ اور وہ حق بجانب بھی تھی۔ یہی باتیں نادیہ مذاق میں، ہنس کر خوشدلی سے کہہ دیتی تو اسے ہرگز برا نہ لگتا۔ مگر یوں اچانک موڈ آف کر لینا، طنز تشنیع پر اتر آنا۔ پھر گھر میں اکیلا چھوڑ کر ٹینس کھیلنے چل دینا شائی کو بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بدزبان تھی منہ پھٹ تھی سب کو معلوم تھا مگر۔ گھر آئے مہمان کی یوں بے عزتی کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

کہیں اب پھر تو کوئی بات نہیں ہو گئی تھی؟

''نن... نہیں تو''۔

مگر پھپھو کی تسلی نہیں ہوئی۔

صاحبو آکر ان دونوں کا ناشتہ میز پر لگانے لگا۔

''نادیہ بی بی کیا لیں گی ناشتے میں؟'' صاحبو نے پوچھا۔

''ذرا ٹھہرو میں دیکھتی ہوں جا کر۔ وہ جاگے تو پھر بنانا۔ ٹھنڈا ہو جائیگا''۔ پھپھو اٹھ کر اندر چل دیں۔

اور شائی آہستہ آہستہ ناشتہ کرنے لگی۔

نادیہ اٹھ چکی تھی۔ تیار ہو رہی تھی۔ پھپھو نے ناشتے کا پوچھا، واپس آتے ہوئے کچن میں صاحبو کو بتایا اور دوبارہ شائی کے پاس آ بیٹھیں۔

''جاگ گئی ہے۔ آملیٹ اور ٹوسٹ بنانے کو کہا ہے''۔ وہ خود بولیں۔

شائی خاموشی سے چھری اور کانٹے سے ٹوسٹ کیساتھ فرائی انڈا کھانے میں مصروف تھی۔

تبھی نادیہ نمودار ہوئی۔ بلو جینز اور مرون شورٹ کوٹ پہنے تھی۔ گہرا میک اپ اور ڈائے کئے ہوئے کھلے بال اچھے لگ رہے تھے۔ پرفیوم کی خوشبو دور تک پھیل رہی تھی۔

''ہیلو''۔ وہ کرسی پر آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہیلو''۔ شائی نے لہجے میں خوشگواری لاتے ہوئے کہا۔

''پھپھو تم کیسی ہو''۔ وہ سیب اٹھاتے ہوئے چھیلنے لگی۔ بہت خوشگوار موڈ میں تھی، ورنہ پھپھو کو وہ کم ہی لفٹ دیتی تھی۔

''ٹھیک ہوں بیٹا''۔ ناشتہ کرتے کرتے پھپھو نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا تھا۔

''کچھ سمجھ بھی لیتی ہو پھپھو یا یوں ہی...'' وہ حسب عادت تمسخرانہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

پھپھو بھی ہنس دیں۔ وہ اسکی ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھیں۔ ہاں شائی سے بدزبانی کا نوٹس ضرور لیا کرتی تھیں۔ کہ بن ماں کے تھی اور وہ اسے اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

''بس بیٹا۔ اپنے مطلب کی خبر سمجھ ہی لیتی ہوں''۔

''وہ... وہ بھی اخبار پڑھنے میں مصروف ہے... تمہارا نبیر''۔

کیا اسی طرح صبح ہوتے ہی اس کا ذکر شروع ہو جایا کریگا؟

اس نے جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اسکی مسکان میں اسکے ذکر سے نشہ اتر آیا تھا، آنکھوں میں سرور چھلکنے لگا تھا۔

شائی کو اپنا دل رکتا محسوس ہوا۔ اپنے خدشات سچ ہوتے نظر آئے!

وہ زیادہ تر اسی کی باتیں کرتی رہی۔

شائی بے بسی سے سب سنتی رہی۔

پھپھو البتہ چونک سی گئیں۔ نادیہ کے شہباز خان کے بے تحاشہ ذکر پر بھی اور ــــ شائی کی بے بسی پر بھی!

کیا ــــ شائی کو نادیہ کی زبانی شہباز خان کا اس انداز میں ذکر کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا؟

کیا...؟یا خداوندا!

شائی کے ننھے سے دل میں شہباز خان تو نہیں بس گیا تھا؟

اب انہیں واقعی اخبار کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

اب انہیں نادیہ کا بے تکان شہباز خان پر ہی بولے چلے جانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

بہر حال ـــ

شائی اندر گئی۔ایک ناول اٹھا لائی۔

"تم پڑھو گی"۔اس نے وہیں بیٹھی نادیہ کو کتاب دکھائی۔"Lilian Peake کی ہے۔ بہت اچھا لکھتی ہے"۔

"Come on Shy___grow up... میں بچوں والی کتابیں نہیں پڑھتی۔ اور ویسے بھی مجھے ریڈنگ والوں کی دنیا بیوقوفوں کی دنیا لگتی ہے"۔اس نے شائی کی پسند کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

شائی ہنس دی۔کرسی قدرے فاصلے پر کھسکائی۔ناول کے صفحے پلٹنے لگی۔

"بس یہ چند صفحے رہتے ہیں یہ ختم کرتی ہوں"۔

"پڑھو پڑھو۔میں ذرا ایک چھوٹا سا چکر لگا کر آتی ہوں"۔

"ٹھیک ہے"۔

اور وہ آس پاس کے سویٹس کے ارد گرد گھومنے چل دی۔

پھپھو صاحبہ کو دوپہر کے کھانے کی ہدایات دینے کے بعد واپس آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے تسبیح پھیرنے لگیں۔

شاکر کے بھی کچن میں صاحبو کاکا کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔سبھی مصروف تھے کہ اچانک نادیہ تیز تیز چلتی اسکے پاس آئی۔

"شہباز خان نیچے ریسٹورانٹ میں کوفی پینے جارہا ہے۔ابھی ابھی میں نے اسکے ملازموں کو کہتے سنا ہے۔میں بھی جارہی ہوں۔

"I want to make friends with him."

اور ـــ شائی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"Ok, wish me good luck." اس نے مزید کہا۔

اور ـــ شائی دھک سے رہ گئی۔

نادیہ اندر گئی۔میک اپ مزید گہرا کیا۔بال درست کئے اور برآمدے کے راستے نکلتی پگڈنڈی پر آئی۔

قدرے نیچے بڑھی،شائی کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو ہاتھ ہلایا اور آگے نکل گئی۔

اس وقت پھر شائی کو محسوس ہوا وہ اسے فاتحانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔کیا اسے معلوم تھا کہ وہ شہباز خان کو چاہتی تھی؟

ہونہہ۔وہ تلخی سے مسکرائی۔یکطرفہ چاہت بھی کوئی چاہت ہوتی ہے جس کا اسے علم ہوگا!

وہ ویسے ہی شہباز خان سے بہت امپریسڈ تھی۔اس سے ملنا،اس سے باتیں کرنا،اسکے قریب رہنا ـــ اسے ایک دنیا فتح کرنے کے مترادف لگ رہا تھا۔ظاہر ہے اسکا انداز فاتحانہ ہوگا۔

شہباز خان سے ملنا ـــ ایک پر جلال،مختار کل جہاں پناہ سے ملنا!

اسکی باتیں ـــ زیادہ تر جن کیلئے وہ آنکھوں سے کام لیتا تھا۔دھیما،خواب آور مگر تحکمانہ لب ولہجہ،مختصر،ذومعنی گفتگو!

اسکا قرب ـــ اسکی مبہم مسکراہٹیں،بولتی آنکھیں،اسکی مدھر مخصوص پرفیوم میں مدغم ہوتی اسکی مہکتی سانسیں!

یہ سب جس نے پا لیا ـــ ایک دنیا ہی تو فتح کر لی۔

نادیہ کا اس میں کیا قصور تھا!

تو ـــ اُسکا خیال درست نکلا۔وہ اسکے پاس صرف شہباز خان کی قربت حاصل کرنے آئی تھی۔اب کسی شک وشبے کی گنجائش نہ رہی تھی۔اس نے خود ہی اقرار بھی کر لیا تھا کہ

'She wants to make friends with him.'

کیا شہباز خان بھی اس سے دوستی کرلے گا؟

وہ تلخی سے مسکرائی۔ کیا کل شام پارک کے پاس نادیہ کیساتھ اسکے بھی قہقہے بلند نہیں ہورہے تھے؟

وہ بھی تو دنوں سے یہاں تھی اُس نے کیوں اسے اپنا پیغام نہیں پہنچایا۔ اُس میں بھی تو Guts نہیں تھے۔ مگر نہیں___

اس نے اسے پیغام دیا تھا۔ خاموش رہ کر بھی۔ بلکہ___ شہباز خان نے ہی پہل کی تھی۔ لیکن___

''ہنہہ''۔ اس نے خود ہی تردید کی۔

محبت کیلئے زبان سے بولنا پڑتا ہے۔ جو وہ نہ کرپائی تھی___ یہاں نادیہ جیت گئی تھی!

ایک بار پھر اسے اپنے جسم میں آگ کے شعلے لپکتے محسوس ہوئے۔ بے کلی مارنے لگی، بے چینی ڈسنے لگی۔

پھپھو نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

''یہ... نادیہ نیچے ریسٹورانٹ میں گئی ہے؟''۔

نادیہ جب شائی سے بات کررہی تھی تو ٹھیک سے سن نہ پائی تھیں۔ کچھ تسبیح پر ورد کی وجہ سے، کچھ نادیہ کی آواز بھی نیچی تھی۔

''ہاں پھپھو''۔ ان سے نظریں ملائے بغیر وہ آہستہ سے بولی۔

پھپھو اب بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔ دکھ سے شائی کو دیکھا۔ اُن کی ننھی سی شائی انجانے میں شہباز خان کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس وقت وہ کوفی پینے ریسٹورانٹ جایا کرتا تھا۔ نادیہ یقیناً اسی کے پیچھے گئی تھی۔ اور یہ بات شائی کو اچھی نہیں لگی تھی۔

''اسکے تو اور بھی بہت دوست ہیں۔ شہباز خان سے کیا لینے گئی ہے''۔ پہلی بار پھپھو نے لب کھولے۔

کہ انہیں بھی اسکی یہ حرکت ناگوار گزری تھی۔

''پھپھو ہمیں ایسا نہیں سوچنا چاہیئے''۔ شائی نے بمشکل کہا۔

''ہاں بیٹا۔ ٹھیک کہتی ہو''۔ پھپھو اتنا ہی بولیں۔

ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سے ورد کرنے لگیں۔

اور پھر ـــــ ایسا ہی ہوتا رہا۔ جہاں شہباز خان ہوتا وہیں نادیہ ہوتی ـــــ دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونجتے۔ تین دن کی بجائے اس نے اپنا قیام طویل کر لیا تھا۔ سارا سارا وقت اسکے پاس رہتی۔ کبھی انکے برآمدے میں، کبھی سویٹ کے اندر، کبھی رائیڈنگ پر تو کبھی ہائیکنگ پر۔

شائی چپ چاپ سب دیکھ رہی تھی۔ لاکھ کوشش کرتی ان دونوں کو نظر انداز کرنے کی پر ایسا کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔

اسکے حسین خدوخال پر اداسی کی مستقل چھاپ لگ گئی تھی۔ چپ رہنے لگی تھی، گم سم۔

پھپھو بھی دیکھ رہی تھیں اسکی خاموشی۔ اندر ہی اندر گھل رہی تھیں وہ بھی۔

نادیہ کے آجانے سے انکا خیال تھا وہ زیادہ مصروف رہے گی، زیادہ خوش رہے گی۔ مگر یہاں تو معاملہ برعکس ہی نکلا۔ وہ ٹکتی ہی نہیں تھی اسکے پاس۔ سارا سارا وقت شہباز خان کے پاس ہی گھسی رہتی تھی۔

اور اب تو معاملہ حد سے بڑھنے لگا تھا۔ وہ آدھی آدھی رات کو سویٹ آنے لگی تھی۔ پھپھو کو اسکی بھی فکر لاحق تھی۔ صاحبو اور شاکر کی نظریں الگ پڑھ رہی تھیں۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی حالات کو کیسے قابو کریں کہ نام تو انہی کا آنا تھا۔ وہ ہی بڑی تھیں انہوں نے ہی خیال رکھنا تھا ہر معاملے کا۔

''تم دیکھ رہی ہو اس لڑکی کے کرتوت''۔ ایک دن وہ بول ہی پڑیں۔ انہیں واقعی فکر لاحق تھی۔ اس میں کوئی خود غرضی شامل نہ تھی۔

شائی خاموشی سے انکا منہ تکنے لگی۔ دیکھ تو وہ ان سے بھی زیادہ رہی تھی مگر ـــــ مرضی تھی نادیہ کی!

''یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یوں کھلے بندوں پھرنا ایک جوان لڑکی کو زیب نہیں دیتا''۔

''اسکی مرضی پھپھو''۔ وہ اتنا ہی بولی۔

''کیا مطلب؟ یوں ہی بے لگام پھرتی پھرے''۔

وہ مسکرا دی۔ بولی کچھ نہیں۔

''میں اسکے گھر خبر کرتی ہوں۔ آ کر لے جائیں اپنی صاحبزادی کو''۔

''نہیں پھپھو۔ بری بات ہے''۔

''تم نہیں سمجھتیں۔ میری بڑی ذمہ داری ہے''۔

وہ خاموش رہی۔ اور پھپھو سوچ میں پڑ گئیں۔ پریشان تھیں اچھی خاصی۔

دوپہر کا ایک بج گیا تھا۔ کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ پھپھو صاحبو کا کی مدد کرنے کچن میں چلی گئیں۔

وہ برآمدے میں سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔

بنگلہ سے سفید آوارہ بادل پورے آکاش کو گھیرے میں لئے تھے، بڑے بڑے قد آور پائینز شان سے ایستادہ تھے، یخ بستہ ہوا کے جھونکوں سے لمبی لمبی گھاس میں سر اٹھائے سفید سفید ڈیزیز آپس میں گلے مل رہے تھے۔

یوں ہی سوچوں میں الجھی وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

دفعتاً ٹھٹھک کر رک گئی ـــــ شہباز خان نادیہ کا ہاتھ تھامے اسکے سامنے آ گیا تھا۔

وہ چند ثانیوں کو جیسے سکتے میں آ گئی۔

پتھرائی آنکھیں اسکی آنکھوں میں گڑھی تھیں۔

اور ـــــ نظریں زخمی تھیں، گھائل تھیں، کربناک تھیں۔

پھر ـــــ بدلیاں دھواں دھواں ہونے لگیں، کنارے بھیگنے لگے، قطرے چھلکنے کو ہوئے ـــــ تو وہ چونکی۔

اور جلدی جلدی سیاہ جھالریں پلکیں جھپکاتی اس کے سامنے سے ہٹتی آگے بڑھ گئی۔

وہ گیا نہیں گیا، یہ اس نے نہیں دیکھا۔

بس سامنے والے پتھر پر بیٹھی اور سر گھٹنوں میں دیتی بے تحاشا رو دی۔ کہ اب ــــ اسکی برداشت جواب دے گئی تھی۔ مزید یارا نہیں رہا تھا، ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

اچھی طرح رو کر دل کی بھڑاس نکال چکی تو ایک عزم کیساتھ سویٹ پر آ گئی۔

پھپھو صاحبو کاکا کیساتھ میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔

"پھپھو، ہم واپس جائینگے"۔

"ہیں؟"

اسکی بھرائی بھرائی آواز، سرخ متورم آنکھیں ــــ وہ دم بخود رہ گئیں۔

"وہ... پیر مڑ گیا میرا، موچ آ گئی ہے"۔ اس نے فوراً بہانہ بنایا۔

یہ تو اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ کہ اسطرح رونے دھونے کے بعد سویٹ آئیگی تو پتہ تو چلے گا ہی۔

"دکھاؤ"۔

اس نے خواہ مخواہ بایاں پیر آگے کر دیا۔

"دھیان سے چلتے ہیں بیٹا۔ یہ تو پہاڑی علاقہ ہے۔ بارش کی وجہ سے گھاس اور پتھروں پر پھسلن ہوتی ہے۔ میں ابھی دوا لگا دیتی ہوں"۔

وہ جلدی سے اپنی الماری کی طرف گئیں۔ مرہم نکالی اور اسکے پاؤں پر لگانے لگیں۔

"پھپھو ہم واپس جائینگے۔ آج ہی..."۔

"یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی تمہیں"۔

"بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے"۔

اور جانے کیوں پھپھو کو لگا۔ اس نے اچانک واپسی کا پروگرام نادیہ اور شہباز خان کی وجہ سے ہی بنایا تھا۔

اس سے قبل وہ اپنے دل کی ہر بات انہیں بتا دیتی تھی۔ اب رازداری برتنے لگی تھی کیونکہ دل میں شہباز خان بس گیا تھا۔

انہوں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا کہ اب وہ زندگی کے اس دور میں داخل ہو رہی تھی جہاں بعض باتیں پردے میں بھی رکھی جاتی ہیں۔

"چلو فی الحال تو کھانا کھاؤ۔ بعد میں بنائیں گے پروگرام"۔

وہ دونوں میز پر آ گئیں۔

"نادیہ آئے گی کھانے پر یا نہیں؟" پھپھو کھانا شروع کرتے ہوئے بولیں۔

اب وہ لوگ بھی زیادہ انتظار نہیں کیا کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ اکثر اوقات کھانے پر غائب رہتی۔

"مجھے نہیں معلوم"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

آج بھی نادیہ دوپہر کھانے پر نہیں آئی۔ وہیں کہیں شہباز خان کیساتھ کھا لیا تھا۔

شائی نے پھپھو کو راضی کر ہی لیا۔

کل صبح دس بجے یہاں سے جانے کا پروگرام پکا کر لیا۔

صاحبو اور شاکر کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ کوئی ایک کام تھوڑی ہوتا تھا سمیٹنے والا۔ پورے سیزن کا سامان، ہوٹیل والوں کا بل، قریبی ٹاؤن سے گاڑی میں پٹرول ڈلوانا وغیرہ وغیرہ۔

مگر ــــ شائی کا ارادہ اٹل تھا۔ مزید یہاں رہ کر وہ گھٹ گھٹ کر ختم ہونا نہیں چاہتی تھی۔

شہباز خان کی بدلی بدلی کیفیت۔ بے دردی، بے حسی کیا کم تھی کہ اوپر سے وہ نادیہ سے پینگیں بڑھا کر اسے خاک کر دینے پر تلا ہوا تھا۔

ڈنر کا وقت ہونے لگا تو نادیہ سویٹ پر آ گئی۔ حسب معمول مسرور اور سرشار!

مگر ــــ کل کی واپسی کا علم ہوا تو گڑبڑا کر رہ گئی۔

وہ تو دنوں میں ہی شہباز خان کے سحر میں ڈوب چلی تھی۔ بہت کچھ سوچ لیا تھا آگے کیلئے بھی۔

شہباز خان کو توجہ کی ضرورت تھی، پیار کی، محبت کی! وہ اسکی کمزوری جان چکی تھی اور اب۔۔۔ تن من دھن سے اس پر اپنی تمام عنایتیں نچھاور کر رہی تھی۔ اسکی یہی کاوشیں ہی شاید کارگر ثابت ہوتیں اور۔۔۔

وہ شہباز خان کی لامحدود املاک کی مالک بن سکتی۔ اسے جانے کیوں اپنے خواب کی تعبیر سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

''شائی میں اتنی جلدی یہاں سے جانا نہیں چاہتی''۔ وہ ٹی وی کے آگے شائی کے پاس بیٹھی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

شائی چپ رہی۔ کہتی بھی کیا۔ کہ مزید رکنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پاگل ہو جانا تھا اس نے یہاں اور رہ کر۔ اور نہیں رکنے کا کہتی تو نادیہ کے افیئر میں خلل پڑنے کا خدشہ تھا۔۔۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا!

''تم سے کیا چھپانا۔ میں اور شہباز خان بہت آگے نکل چکے ہیں۔ وہ بہت دکھی ہے۔ میں اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ اسے میری ضرورت ہے...''۔

نادیہ کے الفاظ شائی کو اپنے کانوں میں پگھلتے سیسے کی مانند لگ رہے تھے۔ جھلملاتی آنکھیں میچ لیں تو چپکے سے دو آنسو خوبصورت گالوں پر آ رہے۔ جلدی سے رخ پھیر لیا کہ نادیہ اسے دیکھ نہ لے۔

پھر اسے خیال آیا۔ یہ اسکی خود غرضی تھی۔ وہ دونوں شہباز خان سے پیار کرتی تھیں۔ اگر اسکی خاموش چاہت کامیاب نہ ہو پائی تھی تو اسے نادیہ کے ہیجان خیز محبت میں حائل ہونے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ سراسر زیادتی تھی، خود غرضی کی انتہا!

''میں جاتی ہوں ذرا شہباز خان کے پاس۔ اس سے بھی ڈسکس کر لوں۔ ڈنر پر میرا انتظار مت کرنا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شائی اب بھی سوچوں میں گم تھی کچھ بولی نہیں۔ صرف پھپھو اسے جاتے دیکھتی رہیں۔ پھر ایک گہری سانس لیتیں ڈرامہ دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

نو بجنے میں دس منٹ تھے۔ صاحبو نے کھانا وہیں لگا دیا۔

''پھپھو''۔ وہ سوچوں سے ابھری۔

''کیا ہے بیٹا''۔

''نادیہ ابھی واپس جانا نہیں چاہتی''۔

''اے اسکے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم اسے لے جا کر اسکی ماں کے حوالے کر دینگے۔ آگے وہ جانے اسکا کام۔ دوبارہ آجائے یہاں اتنا ہی ضروری ہے تو''۔

''ویسے پھپھو یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا نا کہ میں اچانک اعلان کر دوں کہ جانا ہے۔ مجھے اسکا بھی سوچنا چاہیئے تھا''۔

اسے اپنا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ نادیہ اگر شہباز خان کو پا لینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ تو وہ اسکی راہ میں کیوں روڑے اٹکا رہی تھی؟

''وہ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے ہماری مرضی کی پابند ہے۔ نہ کہ ہم اسکی مرضی کے پابند ہوں...''۔ پھپھو کا بھی دل جلا ہوا لگ رہا تھا۔

''پھر بھی پھپھو۔ اچھا نہیں لگتا۔ اگر وہ رہنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے رہ لے۔ صاحبو کاکا اسکے پاس رہ جائینگے''۔

''اور وہاں کا کام کون سنبھالے گا؟''

انکا اشارہ گھر کی طرف تھا۔ آجکل کچن وہاں مالی کے لڑکے نے سنبھالا تھا۔ ٹھیک ہے کھانا اچھا بنا لیتا تھا مگر وہ بات تو نہیں تھی جو صاحبو کی تھی۔ تمام ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی۔

''پھپھو پلیز! آپ دیکھ لیں گی باقی سب۔ بیس پچیس دن کی تو بات ہے''۔ وقت گزرنے کیساتھ ساتھ اسکا احساس ندامت بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ اسکو یہاں سے لے جانے پر مجبور کر لیتی تو اپنے ضمیر کی چبھن اسے کبھی چین نہ لینے دیتی۔ خود غرضی کا اتنا گھناؤنا ارتکاب اسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ شہباز خان تو ویسے بھی نادیہ کو چن چکا تھا وہ کیوں آڑے آتی؟

''تمہارے بھی کیا کہنے ہیں۔اتنی اچھائی بھی اچھی نہیں ہوتی''۔

انہیں جیسے شہباز خان نادیہ کیساتھ اچھا نہیں لگتا تھا۔پھر کیا شائی کیلئے پسند تھا؟

وہ نیم راضی لگنے لگی تھیں۔شائی نے نجات کی سانس لی۔

''میری اچھی پھپھو۔اب میں اطمینان سے جاسکوں گی''۔

''اور اسکی ماں نے اسکے یہاں صاحبو کیساتھ اکیلے رہ جانے پر اعتراض کیا تو...''۔

''میرا خیال نہیں۔مامی لوگ خاصے ایڈوانس ہیں''۔

''جبھی تو بیٹی تتلی بنی پھرتی ہے۔جہاں جی چاہا چل دی''۔

''اسکی مرضی پھپھو''۔

پھپھو کیساتھ لونگ روم میں عشاء کی نماز پڑھ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

خلاف معمول اس نے پردے برابر نہیں کئے۔بتی بھی نہیں جلائی۔نڈھال سی کھڑکی کے پاس رکھی آرمڈ چیئر پر ڈھیر ہوگئی۔سر کرسی کی پشت سے ٹیکتے ہوئے تھکی تھکی آنکھیں موند لیں۔

''واپس چلی جاؤ۔رکنے کی ضرورت نہیں۔کہہ دیا نا''۔

شہباز خان کی آواز تھی۔تیزی تھی جس میں، گرج سی تھی۔

اسکی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔بالکل سامنے ہی وہ برآمدے کے ستون سے ٹکا کھڑا تھا۔ساتھ نادیہ تھی۔کچھ سہمی سی کھڑی تھی۔اردگرد کی بتیوں کی روشنی میں صاف نظر آرہے تھے دونوں۔

لگتا تھا خاصی دیر سے نادیہ کے واپس جانے یا نہ جانے پر دونوں میں بحث ہو رہی تھی۔

اور پھر بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آپہنچی تھی کہ وہ تلخ ہوگیا تھا، بھر گیا تھا۔

وہ نادیہ کی واپسی پر تلخ ہو رہا تھا یا وہیں رہ جانے پر بھر رہا تھا یہ وہ سمجھ نہ سکی۔کہ بحث جیسے خاصی دیر سے جاری تھی۔وہ اسکے چلے جانے کے ذکر پر بھی تلخ ہوسکتا تھا کہ اب تک اسکی اس سے اتنی تو انڈرسٹینڈنگ ہو ہی گئی تھی۔

اور۔۔۔وہ اسکے وہاں رہ جانے پر بھی بھر سکتا تھا کہ۔۔۔

وہ تو تھا ہی ایک مطلق العنان فرمانروا، مختار کل!

کوئی بھی حکم دے سکتا تھا۔اسے واپس جانے کا بھی!

''آپکو میرے چلے جانے کا افسوس نہیں ہوگا''۔قدرے توقت کے بعد نادیہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

''ہوگا۔۔۔کچھ کچھ''۔وہ لاپروائی سے بولا۔تلخی اب بھی وہیں تھی۔

''آپ اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہیں''۔

''ہوجاتا ہے کبھی کبھی ایسا''۔

''میرے ساتھ تلخ مت ہوا کریں۔جان دے دونگی میں''۔

''ہہہ''۔اسکی تلخی سوا ہوگئی۔

''کیوں یقین نہیں آتا''۔

''سب فضول باتیں ہیں۔کوئی کسی کیلئے جان نہیں دیتا''۔

''میں دے دونگی''۔

''ہونہہ''۔تلخی انتہاء پر پہنچنے لگی۔''مجھ میں ایسی کوئی بات نہیں کہ کوئی لڑکی میرے لئے جان دے''۔تلخی کیساتھ اس کے لہجے میں کرب اتر آیا تھا۔

''آپ میں ہی تو وہ سب کچھ ہے، جس کیلئے کوئی بھی لڑکی جان دے سکتی ہے''۔

''No__No, please!''۔وہ اچانک ہسٹیریک انداز میں کہنے لگا۔''میں وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔تم۔۔۔کچھ نہیں جانتیں میرے بارے میں''۔اس پر وحشت چھانے لگی تھی۔''میں صحیح آدمی نہیں ہوں۔میں...میں''۔ایک پل کو اس نے توقف کیا۔پھر۔۔۔وہ ہنسا۔ایسی ہنسی جس میں آنسو تھے، کرب تھا۔''تمہیں معلوم ہے ایک لڑکی نے مجھے گالی دی تھی۔حرام کی اولاد کہا تھا مجھے...''

وہ بہکنے لگا تھا۔کسی شرابی کی طرح۔۔۔جو بہت پی گیا ہو، جس نے اپنی سدھ بدھ کھو دی ہو۔اور پھر سب کچھ اگل دیا ہو۔اپنے من کے بھید، اپنے دل کے راز!

''اوہ''۔

وہ چند لمحے نادیہ کا چہرہ تکتا رہا۔ اسکے سراپے میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ جھکڑ چل رہے تھے۔

''کون تھی وہ؟'' اس کیلئے اسکا یہ روپ شاید نیا تھا، ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''آپ نے کچھ نہیں کہا اسے؟''

وہ ''No—because it's a fact. I am a bastard.'' غرایا—

طوفانوں کے بند ٹوٹ گئے تھے، جھکڑ تباہ کن ہو گئے تھے۔

''I am an illegitimate child of my parents.''

وہ غرایا تھا۔ اسکے باوجود اسکی آواز میں درد تھا، کرب تھا!

بے انتہا قہر و غضب کے باوجود وہ اچانک تھکا تھکا سا، مضمحل مضمحل سا نظر آنے لگا۔

اس نے برآمدے کا ستون تھام لیا۔ اس پر سر ٹیک دیا۔

چند پل نادیہ اسے یوں ہی تکتی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔ اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''مجھے آپکے بارے میں سب معلوم ہے''۔

چونکتے ہوئے سر اٹھا کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ اسکا رنگ نچڑ گیا تھا۔

''آپکا نام پتہ چلتے ہی میں جان گئی تھی کہ آپ کون ہیں''۔ وہ قدرے رکی، اس پر دلربایانہ نظریں ڈالیں۔ ''آپکو کون نہیں جانتا''۔ اس نے مزید کہا۔

''کاش مجھے کوئی نہ جانتا''۔ اب اس کا انداز شکست خوردہ تھا۔ ''تب مجھے ایسی گالی بھی سننے کو نہ ملتی''۔

نادیہ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھی۔

''آپ میں گلیمر اتنا ہے کہ باقی سب کچھ ماند پڑ جاتا ہے۔ آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کم از کم مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا''۔

''تمہیں کیوں فرق نہیں پڑتا؟'' اب جیسے وہ آہستہ آہستہ سنبھل رہا تھا۔

''اسلئے کہ مجھے جو باتیں پسند ہیں وہ آپ میں سب موجود ہیں۔ آپکے ناجائز ہونے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا''۔

''مثلاً؟''

''آں... گلیمر... سٹیٹس...''۔ وہ جیسے سوچ سوچ کر بتانے لگی۔ ''یہی تو ہے سب کچھ۔ بڑے سے بڑے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں''۔

''اوہ''۔ وہ مجروح سا بولا۔

اور— شائی جیسے مزید نہ سن سکی۔ بے سکت سی ٹانگیں سنبھالتی بستر پر آ گئی۔ کپڑے تبدیل کرنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ جوں کی توں پڑ رہی۔ کمبل اپنے اوپر کھینچے اور آنکھیں موند لیں۔ پر—

سر جیسے گھوم رہا تھا۔ ذہن ماؤف اور حواس معطل تھے۔ جو کچھ اس نے سنا تھا کیا سچ تھا؟ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''No—because...I am a bastard.''

وہ غرایا تھا۔ اسکے باوجود اسکی آواز میں درد تھا، کرب تھا!

''I am an illegitimate child of my parents.''

بے انتہا قہر و غضب کے باوجود وہ اچانک تھکا تھکا سا، مضمحل مضمحل سا نظر آنے لگا تھا۔ ستون کا سہارا لیا تھا۔

کتنا دکھی تھا وہ! کتنا غمگین!

اور پھر اسکا تمام تر دکھ اور غم، شائی کے دل میں منتقل ہو گئے تھے، اس کی آنکھوں میں در آئے تھے۔

کتنا بڑا دکھ لئے جی رہا تھا وہ!

کیا وہ واقعی جی رہا تھا؟

''خاص طور سے بیماری سے اٹھنے کے بعد تو بہت ہی تلخ ہو گئے ہیں...''۔

''آپکی زندگی میرے لئے بہت اہم ہے ... آپکی صحت کا خیال رکھنا میرا فرض ہے... کوئی آپ کیلئے زہر ہے ...''۔مختلف موقعوں پر کہی گئی اسماعیل بابا کی باتیں اس کے کانوں میں گونجیں۔

تو۔۔۔ یہ بیماری تھی اسے!

کیسی کیسی اذیتیں برداشت کی ہونگی اس نے۔کیسے کیسے کرب جھیلے ہونگے اس نے!

''گلیمر... سٹیٹس... یہی تو ہے سب کچھ۔''

کتنی بے رحم تھی نادیہ۔کیا واقعی یہی سب کچھ تھا؟

''اوہ''۔۔۔ وہ اس کے جواب میں اتنا ہی بولا تھا۔۔۔ بہت مجروح ہوکر،لہولہان ہوکر۔

بچپن سے لے کر۔۔۔ آج دن تک۔۔۔ اسے زخم ہی زخم ملے ہونگے۔کسی نے لعن طعن کی شکل میں دیئے ہونگے،کسی نے ترس کھا کر اور۔۔۔

اس وقت نادیہ نے اسکا سٹیٹس تول کر!

شائی بے کلی سے کروٹیں بدلتی رہی۔

آج اسے یقین ہوگیا وہ اسے بے پناہ چاہتی تھی۔

کیونکہ دکھ اس کو تھا،درد وہ محسوس کر رہی تھی۔گھائل وہ تھا،ٹیسیں اسے اٹھ رہی تھیں۔ زخم اسے آئے تھے،لہولہان وہ ہو رہی تھی۔۔۔ وہ شہباز خان تھی اور شہباز خان وہ!

دور چرچ کے کلاک نے صبح کے تین بجائے تو اس نے چپکے سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

تھکی تھکی آنکھیں موندیں تو شدید جلن کا احساس ہوا۔پھر۔۔۔ جانے کب نیند کی دیوی مہرباں ہوئی اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

آج بھی وہ گرم اور کڑوی کوفی کے گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔بابا نے آج بھی اسے ٹوکا تھا مگر۔۔۔ کیا کرتا۔اسے تو سکون ہی کوفی کے تلخ گھونٹ میں ملتا تھا۔مجبوری بن گئی تھی اس کی تو۔

''شائی بڑی بور ہے۔اتنے خوبصورت موسم کو چھوڑ کر چلی گئی''۔شہباز خان کیساتھ ریسٹورانٹ میں بیٹھی نادیہ بھی کوفی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

پتہ نہیں کیوں؟اس وقت پھر وہ چونک سا گیا۔رات نادیہ نے اسے بتایا تھا اسکے جانے کا تب بھی وہ چونکا تھا۔

''ویسے ہے، بہت سویٹ،بہت کنسڈریٹ۔اپنا کک اور سویٹ میرے لئے چھوڑ گئی...''

وہ کچھ نہیں بولا۔بڑی بڑی نیلی آنکھیں غیر ارادی طور پر شائی کی مخصوص سیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔کچھ دنوں سے وہ ریسٹورانٹ میں نہیں آ رہی تھی۔۔۔ اسے معلوم تھا ایسا کیوں تھا۔ وہ اسکے رویے سے دل برداشتہ تھی۔

نظریں واپس پھیر کر اس نے نادیہ پر جما دیں۔

''رات سوئے نہیں کیا''۔

اسکی سیاہ چمکتی آنکھوں میں آج سرخ ڈورے بہت نمایاں تھے۔

''نیند نہیں آئی''۔وہ مختصراً بولا۔

غصہ کم کیا کریں نا''۔

''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ساری ساری رات جاگتا ہوں''۔

''اور صبح اٹھتے ہیں تو آنکھیں اور بھی خوبصورت لگتی ہیں''۔

وہ ساری ساری رات کیوں جاگتا ہے؟ ایسے کون سے مضمرات ہیں جو اسے جاگنے پر مجبور کرتے ہیں؟ انکی نادیہ کو کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ مسکراہٹ جو زخمی تھی، گھائل تھی!

''آج جھیل کنارے جائینگے۔ پکنک ہوگی۔ خوب خوب گھومیں گے۔ رات کو واپس۔ نہیں... رات بھی... وہیں رہ لینگے''۔ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بات چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔

دونوں لڑکیاں کزنز تھیں مگر ـــــ کتنا تضاد تھا دونوں میں!

ایک چھوئی موئی سی، شرمیلی شرمیلی سی۔ جو اسکے آگے شکریہ کا ایک لفظ تک ادا نہیں کر سکتی تھی بلکہ ـــــ

وہ تو ـــــ اسکی نظروں کی تاب تک نہ لاسکتی تھی۔ چرا لیا کرتی تھی نظریں، جھک جایا کرتی تھیں آنکھیں، اور لانبی لانبی سیاہ خمیدہ پلکیں ان پر سایہ کر لیتی تھیں۔ اور ـــــ

یہ ـــــ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی تھی۔ چند دنوں میں ہی اس سے اتنی بے تکلف ہوگئی تھی کہ کئی حدود ایک ساتھ پاٹ گئی تھی۔ رات وہیں رہ لینا اسے کوئی معیوب بات ہی نہ لگتی تھی۔

''اور اب میرا خیال ہے اٹھنا چاہیئے یہاں سے''۔

''چلیئے''۔

دونوں باہر آکر اوپر سوئٹس کی طرف آنیوالی پگڈنڈی پر ہولئے۔

''میں تیار ہوتی ہوں پھر چلتے ہیں''۔ نادیہ اس سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے سوئٹ میں گھس گئی۔

شہباز خان نے ایک نظر انکے برآمدے پر ڈالی۔

آج برآمدہ بہت سونا سونا سا لگ رہا تھا۔

اپنے سوئٹ میں گھستے گھستے اسکی نظر شائی کے بیڈ روم کی کھڑکی پر گئی ـــــ مکین چلی گئی تھی

کھڑکی ویران ویران سی لگ رہی تھی۔

بابا کو پکنک کے بارے میں مطلع کرنے کے بعد وہ دوبارہ اپنے برآمدے میں آکر نادیہ کا انتظار کرنے لگا۔ بندوں کی موجودگی کے باوجود قریبی سوئٹ تو سائیں سائیں کر رہا تھا۔

دنوں بعد ایک موہوم سی مسکراہٹ اسکے لبوں کو چھوگئی۔ پڑوسن کے نقوش ہوٹیل پر خاصے گہرے تھے!

نادیہ کے کھنکتے قہقہوں اور رنگین سنگت میں پکنک اچھی رہی۔ دن اچھا کٹ گیا۔

سیندوری شام پر دھندلکے چھانے لگے تھے، پکوانوں کے دھوئیں جا بجا اٹھنے لگے تھے اور اونچے نیچے یہاں وہاں بکھرے کچے پکے گھروں میں بتیاں جل اٹھی تھیں۔

''اب چلنا چاہیئے''۔ وہ دھیرے سے بولا۔

''دل نہیں کرتا''۔

''رات کو بھیڑیئے کھا جائینگے''۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

نادیہ کو نہ سہی۔ اسے تو خیال تھا۔ ایک جوان لڑکی کا رات کے اندھیروں میں ایک جوان مرد کیساتھ بھٹکتے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔

وہ لوگ ہوٹیل واپس آگئے۔

ریسپشن سے اوپر سوئٹ جانے والی پگڈنڈی پر ہولئے تو ـــــ

نادیہ کو سوئٹ پر چھوڑتے چھوڑتے وہ ایک بار پھر چونکا۔ بتیاں تو سب روشن تھیں، یہ سوئٹ آج اتنا بے رونق کیوں تھا؟

''میں آؤنگی۔ آج ساری رات باتیں کرینگے''۔ نادیہ نے اسے گال پر بوسہ دیا۔

''سوری مائے ڈیئر۔ آج میں سوؤں نا۔ ہوں''۔

نادیہ پر اوس پڑ گئی۔ آج تو موقعہ تھا۔ گو شائی یا پھپھو نے کبھی اسے ٹوکا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی۔ ایک رکاوٹ تو تھی۔

''نہیں... میں آؤنگی''۔

''نہیں۔۔۔ میں سوؤں گا''۔

''پلیز!''

''کہانا...''۔

اور شہباز خان کی 'کہانا' پر وہ اکثر سہم جایا کرتی تھی کہ اس سے آگے وہ خطرناک حد تک سیریس ہو جایا کرتا تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا اور نادیہ خفیف سی ہوتے ہوئے سوئیٹ کے اندر چلی گئی۔

صبح نو بجے وہ اپنے برآمدے میں ناشتے کی میز کے آگے بیٹھا گھونٹ گھونٹ کر کے جوس پی رہا تھا۔ ساتھ ہی معمول کے مطابق اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

بادلوں کے ریلے اسکی سانسوں میں مدغم ہونے لگے تو اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

مسحور سا ہوتا آس پاس کی فضا کو اپنے آپ میں جذب کرنے لگا۔

نظریں ادھر ادھر بھٹکتیں اپنے پڑوس کی کھڑکی پر آٹکیں۔ خلاف معمول آج بند تھی۔

آج کوئی اس میں سے اسے دیکھنے والا نہیں تھا۔ مگر۔۔۔

اسے اس قدر گہری مایوسی کا احساس کیوں ہوا تھا؟

چند ثانیے یوں ہی وہ بند کھڑکی کو تکتا رہا۔

پھر۔۔۔ ایک گہری سانس لی۔ اپنے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

چائے کا کپ منہ سے لگاتے لگاتے نظریں ایک بار پھر نیچے دو چار قدم پر ہی پڑوس کے برآمدے پر گئیں۔

وہ یہیں اپنے برآمدے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔۔۔ وہ نیچے ریسٹورانٹ میں کوفی پینے جانے کیلئے تیار تھا۔ اپنے دروازے سے نکلتے نکلتے اس کی نظریں اس پر پڑی تھیں، نظریں بھی ملی تھیں مگر۔۔۔

وہ بالکل اجنبی بن گیا تھا۔ نظروں میں سے ہر قسم کی شناسائی ختم کر دی تھی، کوئی یگانگت باقی نہیں رہنے دی تھی۔

بالکل سپاٹ، کوری رکھی تھیں اس نے اپنی نگاہیں۔

جیسے روز اس سے مڈبھیڑ ہی نہ ہوتی ہو، جیسے وہ اس کے قریب ترین سوئیٹ میں ہی نہ

رہتی ہو، جیسے وہ اسکی پڑوسن ہی نہ ہو۔

وہ ڈھلان اترتا اسکے قریب سے ہوتا نیچے ریسٹورانٹ والی پگڈنڈی اترنے لگا تھا تو وہ۔۔۔ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔

اور پھر۔۔۔ پہلی بار وہ کوک یا آئس کریم کھانے ریسٹورانٹ میں نہیں آئی تھی۔

اور۔۔۔ اس دن کے بعد سے وہ وہاں گئی ہی نہیں تھی۔

اچانک عقب سے اسماعیل بابا کے نمودار ہونے سے وہ چونکا۔ اور اپنی ٹھنڈی پڑتی چائے ہٹا کر دوسرا گرم کپ بنانے لگا۔

نادیہ دس بجے ہی آ گئی تھی۔ نیچے ریسٹورانٹ میں کوفی پینے بھی اسکے ساتھ گئی تھی مگر جانے کیا بات تھی؟

شہباز خان کے رسپانس میں وہ گرم جوشی نہ رہی تھی۔ شاید اسلئے بھی کہ اب شائی یہاں نہیں رہی تھی جسے وہ بقول اسکے خود جلانے کو یہ سب کر رہا تھا۔

دوپہر دو بجے وہ اکیلا ہی لنچ کیلئے اپنے سویٹ سے نکلا۔ چند ہی قدم بڑھائے تھے۔۔۔ یہیں وہ، باہر کہیں سے سر جھکائے سوچوں میں گم اپنے برآمدے کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ پگڈنڈی پر اسکے بالکل پاس آ کر یکدم ہی رک گیا تھا۔ وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی تھی۔

اس نے اپنی نظریں بالکل سپاٹ کر لی تھیں، بے حس!

اسکی حسین آنکھیں گھائل ہو اٹھی تھیں، کرچیاں ہو گئی تھیں پرلش کرسٹلز کی!

لانبی سیاہ خمیدہ پلکیں جھکاتے ہوئے اس نے گویا نم آنکھیں چھپا کر اپنی کمزوری چھپانا چاہی تھی مگر۔۔۔

اس نے سب دیکھ لیا تھا۔

ڈائننگ ہال کے دروازے پر پہنچتے ہوئے اس نے خیال ذہن سے جھٹکا۔

لنچ کے بعد واپس اوپر آنے لگا۔۔۔ اسے خیال آیا۔

دھوپ ڈھل رہی تھی۔ وہ اور فاروق پولو کے میچ سے واپس ہوٹیل پہنچے تھے۔ اسی پگڈنڈی پر اوپر آ رہے تھے۔

وہ حسب معمول اپنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ وہ۔۔۔

سپاٹ چہرہ لئے آگے بڑھ گیا تھا لیکن۔۔۔

اسکی بے حسی اسکے ننھے سے دل میں اترتے ہوئے اسے لہولہان کر گئی تھی۔ باوجود کوشش ضبط کے اسکی خوبصورت بڑی بڑی کاسنی مائل آنکھیں جھلملا اٹھی تھیں۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ انکے برآمدے کے پاس سے گزرا اور اپنے سویٹ کی طرف بڑھ آیا۔

نادیہ وہیں برآمدے میں کھڑی اسے اپنی منتظر نظر آئی۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ جیسے اسے مداخلت کرتی محسوس ہوئی۔

"میں سوؤں گا محترمہ"۔ پاس آتے ہی وہ گویا ہوا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ رات بھی سونے کا بہانہ اس وقت بھی سونے کی رٹ"۔

"عادت کی بات ہے۔ کیا کیا جائے"۔ اس نے جیسے کوشش کر کے لہجے میں خوشگواری بھری تھی۔

ایسا کیوں تھا؟

"میں نہیں سونے دونگی"۔

"میں۔۔۔ سوؤں گا"۔ وہ بگڑ سا گیا۔

کل شام کے بعد سے جانے کیا بات تھی؟ وہ اسے جیسے زبردستی برداشت کر رہا تھا۔

مگر وہ بھی باز نہیں آئی۔ تمام دوپہر اس کے سر پر مسلط رہی۔

شام پانچ بجے بابا نے آ کر گھوڑوں کے آنے کی اطلاع دی۔ کچھ دنوں سے نادیہ باقاعدگی سے اسکے ساتھ رائیڈنگ پر جایا کرتی تھی۔

"آج میں نہیں جاسکوں گا"۔

وہ واقعی دوپہر کو آرام لینے کا عادی تھا۔اس وقت نہ سونے کی وجہ سے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔

''جانا پڑیگا۔اٹھیئے''۔نادیہ نے اسے ہاتھ سے پکڑا۔

''چھوڑو ہاتھ''۔وہ بیزاری سے بولا۔''چلتا ہوں''۔

اور پھر وہ دونوں رائیڈنگ کیلئے تیار ہو کر باہر نکل آئے۔

اس دن وہ یہیں کھڑا تھا۔رائیڈنگ کیلئے تیار۔بالکل اسکے سامنے،تین چار قدم کی اونچائی پر۔رخ بھی اسی کی طرف تھا۔

وہ اپنی شیپر ون کیساتھ برآمدے میں بیٹھی چپس کھا رہی تھی۔اسکی موجودگی کا احساس ہوتے ہی جیسے۔

دل دھڑک اٹھا تھا اسکا،ہاتھ میں پکڑا کانٹا لرز گیا تھا،نظریں چار ہونے کے خدشے سے لڑکھڑا گئی تھیں۔

پھر۔۔۔اس نے ہمت کر کے اوپر دیکھا تھا۔

وہ تب بھی یہیں کھڑا تھا پر۔۔۔

معمول کے مطابق نظریں اس پر جمی نہیں تھیں،چہرے پر ڈھکی چھپی شوخی نہیں تھی، ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔

لگتا تھا اسکے سامنے انکا سویٹ تو تھا مگر۔۔۔

کوئی ذی روح موجود نہیں تھا!

پھر۔۔۔وہ مڑا تھا۔گھوڑے پر بیٹھا تھا اور پچھلی چڑھائی چڑھنے لگا تھا۔اس سے نظریں ملائے بغیر ہی،چہرے پر اپنائیت لئے بغیر ہی۔ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ لئے بغیر ہی۔

''آیئے جناب''۔نادیہ تھی،گھوڑوں کے پاس کھڑی تھی۔

وہ چونکا۔اور آگے بڑھ کر گھوڑے پر بیٹھتا اسکے ساتھ چل دیا۔

آج اسکی سنگت میں اسے بار بار تشنگی کا احساس ہو رہا تھا۔

شام کو واپسی پر وہ دونوں ایک ڈھلان اتر کر پکی سڑک پر آنے لگے۔

اسی دن۔۔۔یہیں سے وہ نیچے سڑک پر آ رہا تھا۔شائی بھی اپنی شیپر ون کیساتھ اسی راستے سے ہوٹل جا رہی تھی۔

وہ ڈھلان اتر چکا تھا،سڑک پر آ چکا تھا،چند ساعتوں کیلئے بالکل اسکے پاس سے ہو کر جا رہا تھا۔

مگر۔۔۔نظریں ایک بار بھی اسکی نظروں سے ملی نہیں تھیں،نہ ہی نقوش پر اپنائیت چھائی تھی،نا ہی لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

وہ انکے آس پاس،ارد گرد دیکھ رہا تھا مگر نہیں دیکھا تھا تو بس پہلے کی طرح اسکی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔بالکل جیسے سب دیکھ بھال رہا تھا مگر۔۔۔جانتا نہیں تھا جیسے اسے!

وہ سڑک پر خاصا دور نکل گیا تھا۔پر۔۔۔اسے اداس کر گیا تھا،دکھی کر گیا تھا!

سوچوں میں کھویا وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا،نادیہ آگے نکل گئی تھی۔

تبھی اسے یاد آیا۔۔۔یہاں سے کچھ پیچھے اسی سڑک پر پارک کے آگے وہ اور فاروق پیدل جا رہے تھے۔اس دن بھی وہ رائیڈنگ پر گئے تھے مگر آگے لینڈ سلائیڈ کی وجہ سے جا نہیں سکے تھے،واپس آ گئے تھے۔پھر فاروق کے کہنے پر وہ لوگ واک کرتے ہوئے پارک کے پاس سے گزر رہے تھے۔

وہیں شائی 'میری گوراؤنڈ' پر گول گول گھوم رہی تھی۔۔۔اور وہیں۔۔۔فاروق نے نادیہ کا اس سے تعارف کروایا تھا۔

پھر فاروق اپنے لئے تھروٹ پینٹ لینے کیمسٹ کی دکان پر چلا گیا تھا اور نادیہ اس سے باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔

وہ تب بھی سمجھ گیا تھا وہ اسکی پوزیشن اسکے سٹیٹس سے متاثر ہوئی تھی۔اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی اور شاید اس سے آگے بھی۔

لیکن۔۔۔اسے یہ موقع غنیمت لگا تھا۔شائی کو جلانے کا یہ بہت اچھا طریقہ تھا۔کہ اسی کی

کزن سے بے تکلفی بڑھائی جائے۔اس طرح سے اسے اور زیادہ جلایا جاسکتا تھا۔

لیکن ــــ دو ہی باتیں ہوئی تھیں کہ 'میری گوراؤنڈ' پر بیٹھی شائی بے چین سی نظر آنے لگی تھی۔ 'میری گوراؤنڈ' سے اتر کر اپنی شیپر ون کے پاس جا بیٹھی تھی۔انکی طرف پیٹھ تھی، شیپر ون سے باتیں بھی کر رہی تھی مگر وہ جانتا تھا وہ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔نہ انکی بات نہ اپنی ــــ شعلوں کی ایک لپک سی جو اسکے جسم میں سرایت کر رہی تھی وہ بھی محسوس کر رہا تھا۔

کھویا کھویا سا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پکی سڑک چھوڑ کر دائیں طرف مڑتے ہوئے وہ نیچی سی سرسبز ڈھلان پر گھوڑا آگے بڑھانے لگا۔ہوٹیل کے یہاں وہاں، اوپر تلے بکھرے سرخ کھپریل کی ڈھلانی چھتوں والے سوئیٹس نظر آنے لگے تھے۔

وہ ٹھٹھکا۔

رفتار مدھم پڑ گئی۔

یہیں ــــ بالکل اسی جگہ وہ سوچوں میں گم ہوٹیل کی طرف سے چلی آ رہی تھی۔

مخالف سمت سے وہ نادیہ کا ہاتھ تھامے اسکے بالکل سامنے آ گیا تھا۔وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

چند ثانیے کو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔پتھرائی آنکھیں اسکی آنکھوں میں گڑھی تھیں اور ــــ نظریں زخمی تھیں، گھائیل تھیں، کربناک تھیں۔

پھر ــــ بدلیاں دھواں دھواں ہونے لگیں، کنارے بھیگنے لگے، قطرے چھلکنے کو ہوئے۔ تو وہ چونکی تھی۔

اور جلدی جلدی سیاہ جھالریں پلکیں جھپکاتی اسکے سامنے سے ہٹتی آگے بڑھ گئی تھی۔

اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔سامنے والے پتھر پر بیٹھتے ہوئے اس نے سر گھٹنوں میں دے دیا تھا۔وہ یقیناً رو رہی تھی۔کہ اب ــــ

شاید اسکی برداشت جواب دے گئی تھی۔مزید یارا نہیں رہا تھا۔ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے!

اس نے اسکے ساتھ زیادتی کی تھی اس وقت اسے شدت سے احساس ہوا!

گہری سانس لیتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔

نادیہ گھوڑا سائیس کے حوالے کیئے اسکے سوئیٹ کے برآمدے میں اسکی منتظر کھڑی تھی۔

اسے سخت بیزاری کا احساس ہوا۔کچھ تو وقت انسان کا اپنا بھی ہونا چاہیئے۔

گھوڑے سے اترتے ہوئے وہ سوئیٹ کی طرف بڑھا۔

نادیہ بھی اسکے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔

تھکا تھکا سا وہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ مضمحل سی نشیلی آنکھیں موند لیں۔

''آج ڈنر کیلیئے پاس والے شہر جائینگے۔پتہ ہے کتنی گہما گہمی، شور شرابہ اور رونق ہوتی ہے وہاں''۔وہ اسکے پہلو میں بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

وہ خاموشی سے آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ماتھے پر البتہ ناگواری کے شکن گہرے ہو گئے۔

نادیہ نے آگے بڑھتے ہوئے اپنے ہونٹ اسکے گال پر رکھ دیئے۔

اس نے اُسے آہستہ سے اپنے سے الگ کر دیا۔آنکھیں کھولتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

نادیہ کھسیانی سی ہو گئی۔

''موڈ کیوں خراب ہے''۔

''بس ہو جاتا ہے کبھی کبھی''۔ہلکی سی ناگواری اسکے لہجے میں بھی جھلک آئی تھی۔

تبھی دستک ہوئی۔بابا دونوں کیلیئے چائے اور ہنٹر بیف کے سینڈوچ لے آئے۔

''پاس کے شہر جائینگے نا''۔اسکے لئے چائے بناتے ہوئے اس نے یاددہانی کرائی۔

''نہیں گئے تو؟''اس نے اپنا کپ اٹھا لیا۔

''جائینگے''۔

''پلیز ــــ یہیں ڈنر کر لینگے اور اسکے بعد میں سوؤں گا۔مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا''۔

نادیہ پر اوس پڑ گئی۔

''ڈنر یہیں کر لینگے مگر سونا ووَنا بالکل نہیں''۔

''رات سونے کیلئے ہوتی ہے محترمہ''۔ کوشش کر کے اس نے لہجہ خوشگوار بنالیا۔

''جب آپ ساتھ ہوں تو پھر سونے کیلئے نہیں ہوتی''۔

''میں ساتھ نہیں رہونگا''۔

''کہاں جائینگے''۔

''میں نہیں جاؤنگا۔ تم جاؤ گی اپنے سویٹ میں۔ میں یہیں رہونگا۔ سوؤں گا''۔

''پلیز!''

''نہیں ___ اور آج جلدی ڈنر کرینگے میں جلدی سوؤں گا''۔ اسکا فیصلہ اٹل تھا۔

ڈنر کے فوراً بعد شہباز خان نے نادیہ کو چلتا کیا اور واقعی۔

خلاف معمول سونے کیلئے بستر میں جلدی گھس گیا۔

اس رات گیارہ بج چکے تھے ___ وہ اور فاروق کوفی پیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔

فاروق تمام وقت شائی کی حمایت میں بول رہا تھا۔

''بڑا سائیڈ لے رہے ہو''۔ اس نے کہا تھا۔

''وہ بہت معصوم ہے، چھوٹی ہے... یہ سب اسکی برداشت سے باہر دکھتا ہے''۔ فاروق نے جواب دیا تھا۔

''ہوں؟''

''ایک کام کرو۔ تم اسکی کزن سے گپ شپ کرو میں ___ اس کا خیال رکھونگا''۔

''کیا مطلب؟'' وہ بڑے زور سے چونکا تھا۔

اس وقت پھر ___ چونکا ___ پہلے سے بھی زیادہ زور سے۔

کیوں؟

باتوں کا سلسلہ آگے بڑھا تھا۔

''اسکی کزن سے تو میں اسے جیلس کرنے کیلئے باتیں کر رہا تھا''۔ فاروق کی کسی بات کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

''میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جناب۔ کہ یہ سب اس بچاری کو جلانے کیلئے ہو رہا ہے''۔

''بچاری، معصوم ___ اتنا سائیڈ کیوں لیتے ہو''۔

''وہ ہے ہی ایسی''۔

''کیا؟'' وہ پھر چونکا تھا۔

پر آج ___ اس دن سے زیادہ چونک اٹھا تھا۔

جانے کیوں؟

باتیں اور آگے بڑھ رہی تھیں۔

''کیوں اس بچاری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو''۔

''بچاری۔ بچاری۔ بچاری۔ پاگل کر دیا ہے تم نے''۔ وہ یکدم ہی آپے سے باہر لگنے لگا تھا۔

فاروق کی اتنی ساری حمایت پر اس وقت بھی اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

کیا ہو گیا تھا اسے

''کیا حسن پایا۔ یار۔ میں تو قائل ہو گیا''۔ اچانک اسکے کانوں میں پولو میچ سے واپسی پر شام کو چائے پیتے ئے فاروق کے شائی کے متعلق کہے ریمارکس گونج اٹھے۔

اسکی ہارٹ بیٹ: ہ گئی۔

''غضب کے نقش ہیں... اور پھر پر پلش آنکھیں تو قیامت ڈھاتی ہیں... سیاہ لمبی لمبی پلکیں...''

دل کی تیز ہوتی دھڑکن کے ساتھ ساتھ اسکی نشیلی آنکھیں پوری پھیل گئیں۔

''تمہارا قصور نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر تو کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے...''۔

شہباز خان نے سیدھا ہوتے ہوئے سر بستر کی پشت سے ٹیک لیا۔

تھوڑی دیر وہ یوں ہی پشت سے سر ٹکیے کمرے میں ملگجے اندھیرے کو گھورتا رہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور بڑے بڑے گھونٹ لیتا پی گیا۔

دوبارہ لیٹا۔ آنکھیں موندیں۔ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے آپ کے بارے میں سب معلوم ہے"۔ اچانک جانے کہاں سے اسے نادیہ کی بات یاد آ گئی۔

چونکتے ہوئے سر اٹھا کر وہ اسے دیکھنے لگا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ایک دنیا اسکے ناجائز ہونے کے بارے میں جانتی تھی اس وقت پھر اسکا رنگ بلیچ ہو گیا تھا، سانسیں رکنے لگی تھیں۔

"آپکا نام پتہ چلتے ہی میں جان گئی تھی کہ آپ کون ہیں"۔ وہ قدرے رکی تھی، اس پر دلربایانہ نظریں ڈالی تھیں۔ "آپکو کون نہیں جانتا"۔ اس نے مزید کہا تھا۔

"کاش مجھے کوئی نہ جانتا"۔ اسکا انداز شکست خوردہ تھا۔ "تب مجھے ایسی گالی بھی سننے کو نہ ملتی"۔ اس نے کہا تھا۔

وہ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھی۔

"آپ میں گلیمر اتنا ہے کہ باقی سب کچھ ماند پڑ جاتا ہے۔ آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کم از کم مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

"تمہیں کیوں فرق نہیں پڑتا"۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھل رہا تھا۔

"اسلئے کہ مجھے جو باتیں پسند ہیں وہ آپ میں سب موجود ہیں۔ آپکے ناجائز ہونے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا"۔

"مثلاً؟"

"آں... گلیمر... سٹیٹس"۔ وہ جیسے سوچ سوچ کر بتانے لگی تھی۔ "یہی تو ہے سب کچھ۔ بڑے سے بڑے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں..."۔

دونوں میں کتنا فرق تھا! غیر ارادی طور پر وہ شائی اور نادیہ کا مقابلہ کرنے لگا۔

اُس نے اُسے مسترد کر دیا تھا کہ وہ ایک ناجائز اولاد تھا۔ اُس نے اسکے گلیمر اور سٹیٹس کو ٹھوکر مار دی تھی۔

اِس نے اسے قبول کیا تھا، اسکے ناجائز ہونے پر گلیمر اور سٹیٹس کو ترجیح دی تھی۔

آج وہ پہلی بار اسے حق بجانب لگی۔ سچی اور کھری بات کہنا کیا عیب تھا؟

ایک نے گالی دی تھی ___ ایک نے تعریف کر دی۔

اسکے باوجود اسے شائی زیادہ کھری لگی۔ گالی دی تھی پر سچ کو سچ کہا تھا۔ حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا تھا۔

چھوئی موئی کی طرح نازک اور شرمیلی ہونے کے باوجود وہ اسے بہت بولڈ لگی۔

اور نادیہ ___ بے باک ہونے کے باوجود بہت بزدل معلوم ہوئی۔

وہ بہت نازک تھی۔ فریجائیل سی۔ لگتا تھا چھو لینے سے ٹوٹ جائیگی۔ کانچ کی خوبصورت چوڑیوں کی طرح!

ایک بار وہ ریسٹورانٹ سے کوک پی کر نکلی اور اپنے سویٹ جانے کیلئے اوپر جاتی پگڈنڈی پر ہولی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔ کہ اچانک اسکا پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے آئی۔

جس حساب سے وہ پھسلی تھی جانے کہاں جا پہنچتی۔ اس نے کچھ بھی سوچے سمجھے بنا جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا اور وہ گرنے سے بچ گئی۔

کیوں اسے سہارا دیا تھا؟ اچانک اس نے خود سے سوال کیا!

وہ تو ان دنوں اسے صرف اپنی طرف Attract کرنا چاہتا تھا اور بس!

کیا واقعی صرف اتنا ہی تھا؟

آج وہ بڑے عجیب سوال کر رہا تھا اپنے آپ سے!

اسی طرح ایک دفعہ وہ رائیڈنگ سے واپس آ رہا تھا۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اور ہر سو بادل پھیل جانے کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔

سڑک کی طرف آتے ہوئے وہ ڈھلان اترنے لگا تو دیکھا وہ اکیلی سڑک پر جا رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور ایک آدمی جیسے بڑی دیر سے اسکا پیچھا کرتا اسکے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

وہ گھوڑا تیز دوڑاتا ان تک پہنچا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار تھپڑ اس آدمی کے چہرے پر رسید کیا اور بنا کچھ سوچے شائی کو اچک کر اپنے آگے گھوڑے پر بٹھایا اور لمحوں میں ہوٹل پہنچا دیا۔

کیا وہ سب بھی صرف اسے Attract کرنے کو کیا تھا؟

کیا اس وقت واقعی اسے اس کی عزت کا خیال نہیں تھا؟

اور پھر ـــ

اس دن دھوپ ڈھل چکی تھی، کہرا گھر آیا تھا، شام دھواں دھواں ہو رہی تھی۔

اس وقت بھی وہ رائیڈنگ ہی سے واپس آ رہا تھا۔ دور سے دیکھا وہ ٹیلیفون ایکس چینج والے اونچے نیچے کچے راستے پر چلتی پکی سڑک کی طرف آ رہی تھی۔ پھر شاید اسے کانٹا وغیرہ چبھ گیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر اپنا پاؤں دیکھنے لگی ـــ پھر اٹھ کر دوبارہ چل پڑی۔

وہ سب بغور دیکھ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اسکی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا چند ہی قدم بعد وہ پھر رک گئی تھی۔ وہیں سڑک کے ایک طرف بیٹھ کر پھر سے اپنا پاؤں دیکھنے لگی تھی۔

تبھی وہ پاس چلا آیا۔

اسکا پیر زخمی تھا، خون رس رہا تھا۔ وہ جلدی سے گھوڑے سے اتر کر اسکے پاس دوزانو ہو بیٹھا تھا۔ جیب سے رومال نکالا تھا اور بغیر کچھ کہے سنے اسکے زخم پر باندھنے لگا تھا۔ رومال باندھ کر وہ چند ثانیے یوں ہی بیٹھا اسے تکتا رہا تھا۔ اسنے جھکی سیاہ خمیدہ پلکیں اٹھا کر بمشکل اسکی طرف دیکھا تھا۔ زخم کی وجہ سے اسکی حسین کھوجتی آنکھوں میں تکلیف اتر آئی تھی۔

دو پل وہ اسکی آنکھوں میں تشویش سے دیکھتا رہا تھا۔

پھر ـــ اس نے تسلی کیلئے اپنائیت سے اسکا گال تھپتھپایا تھا۔

کیوں کیا تھا یہ سب؟

اسے مصیبت میں دیکھ کر رکا کیوں تھا؟ اسکا زخمی پاؤں دیکھ کر فوراً ہی گھوڑے سے اتر کر اسکے پاس بیٹھا کیوں تھا؟ اپنا رومال اسکے زخم پر کیوں باندھا تھا؟ اور پھر۔

اسکی آنکھوں میں زخم کی تکلیف دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں اسکا گال کیوں تھپتھپایا تھا؟

کیا یہ سب بھی صرف اسے اپنے پیچھے لگانے کو کیا تھا؟

پھر ـــ اس نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے گھوڑے پر بٹھایا تھا۔ خود بھی اسکے پیچھے بیٹھا تھا اور۔ اس دن پھر اسے ہوٹل کی جانب لے چلا تھا۔

اسے بازو کے حلقے میں لئے وہ سختی سے اسے اپنے سینے سے جکڑے تھا۔ اسکے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب اور سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں، شائی کے بالوں کی اڑتی لٹوں میں وہ اپنا چہرہ سموئے دے رہا تھا۔

تب اس نے سوچا تھا یہ سب ـــ ایک حسین لڑکی اور جوان مرد کی قربت کا قدرتی ردعمل تھا اور بس!

مگر ـــ اسے سینے سے چمٹائے وہ اسکے لمس سے محظوظ بھی ہوا تھا۔ تبھی تو دل کی دھڑکنیں بے ترتیب اور سانسیں قابو میں نہ رہی تھیں۔ اسکے سیاہ گھنے مہکتے بالوں میں چہرہ دیئے وہ مسحور بھی ہوا تھا۔

اگر وہ اسے Attract ہی کر رہا تھا۔ تو خود کیوں بے قابو ہو رہا تھا؟

دور اس پار اونچی پہاڑی پر قدیم گرجے کے کلاک نے صبح کے تین بجائے ـــ تو وہ چونکا۔

کئی گھنٹوں سے برابر وہ اسی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

کیا ہو گیا تھا اسے؟

"تم؟"

فاروق کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

شہباز خان جو اسکے آفس میں اسکے سامنے کھڑا تھا۔لائیٹ گرے ٹراؤزرز اور رائیل بلو شرٹ میں ملبوس تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"تم نے تو کہا تھا ایک مہینہ اور رہو گے"۔فاروق اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔

"بس دیکھ لو۔تمہاری یاد آئی اور چلا آیا"۔

"بیٹھو"۔فاروق نے اسے اپنے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔"صرف اتنا تو بالکل نہیں کہ میری یاد آ گئی۔کچھ اور بھی ہے۔بتاؤ کیا بات ہے"۔وہ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

شہباز خان صوفے پر بیٹھ گیا۔ٹانگیں سامنے سیدھی پھیلا دیں۔سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔۔۔ایک گہری تھکی سانس لی۔

"بات کیا ہے ہاں"۔

"وہ۔۔۔شائی نے پریشان کر رکھا تھا ساری رات۔پانچ بجتے ہی چل پڑا"۔

"کیا؟" فاروق پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔اپنی کرسی سے اٹھ کر سیدھا اسکے پاس آ بیٹھا۔

"شائی سے صلح ہو گئی کیا؟"

"نہیں یار"۔

"تم جو بھی کہہ رہے تھے کہ ساری رات پریشان کر رکھا تھا شائی نے"۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"وہ تو وہاں ہے بھی نہیں۔واپس آ چکی ہے"۔

"پھر؟"

"بس جب سے وہ چلی آئی وہاں سے۔مجھے سب سونا سونا لگنے لگا۔" وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

فاروق خاموشی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

"پھر۔۔۔جس جس جگہ سے گزرتا تھا،جہاں جہاں میں نے اس سے زیادتیاں کی تھیں۔انکا بری طرح احساس ہونے لگا۔اور یہ رات۔۔۔تو سارا وقت میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کے متعلق سوچتا رہا۔جانے کیا ہو گیا تھا مجھے۔صبح ہونے لگی تو اچانک خیال آیا آجکا سارا دن بھی اسی طرح گزریگا؟ قدم قدم پر اسکا خیال آئیگا،جگہ جگہ وہ نظر آئیگی۔۔۔پتہ ہے اسکا سویٹ اسکے بغیر کتنا سونا سونا لگ رہا تھا۔۔۔"

اور۔۔۔اچانک فاروق کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

"تمہیں تو محبت ہو گئی ہے یار"۔

"پتہ نہیں۔مگر آج میں وہاں اس کے نہ ہونے اور قدم قدم پر اس سے زیادتی کرنے کے پچھتاوے کے خوف سے وہاں سے بھاگ آیا ہوں"۔

"بات کچھ سیریس لگ رہی ہے"۔

"اور مجھے اسکی وہ بات بھی اب اتنی بری نہیں لگتی"۔اسکی بات پر کوئی خاص دھیان دیئے بغیر وہ پھر کہنے لگا۔"اسے نادیہ سے کمپیئر کیا تو لگا کہ وہ زیادہ اچھی تھی۔سچ کو سچ ہی کہا تھا نا۔یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرا گلیمر،میرا اسٹیٹس میرے ہر عیب پر پردہ ڈالتے ہیں۔نادیہ کا خیال تھا میری یہ چند خوبیاں میرا ہر عیب چھپانے کو کافی ہیں۔۔۔"۔وہ کچھ کھویا کھویا سا کہہ رہا تھا۔

"میں شروع دن سے جانتا تھا وہ مجھ سے زیادہ میرے پیسے سے متاثر ہے لیکن۔۔۔اس بات کے بعد سے تو میں اسے برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔۔۔شائی اسکے مقابلے میں مجھے کہیں اچھی

لگی"۔

فاروق مسکرا دیا۔

"وہ ہے بھی اچھی لڑکی"۔

شہباز خان مسکرا دیا۔

"تم جب اسکی سائیڈ لیتے ہو تو۔۔۔ I feel jealous"

اس لمحے وہ فاروق کو بہت معصوم سا لگا۔

"اوہ ۔۔۔ آئندہ خیال رکھونگا"۔

"خیر چھوڑو۔ میں اسے اپنے اوپر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو بس جو جو محسوس کیا۔ تمہیں بتا دیا۔ کون سا اس نے مجھے قبول کیا تھا اور کون سا میں..."۔ اس نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔ "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

فاروق زیر لب مسکرایا۔

بڑی سادگی سے اپنے من کا تمام راز کھول کر، شائی کیلئے اپنی تمام بے قراریاں بیان کر کے، یہاں تک کہ اپنی زیادتیوں کے پچھتاوے سے خائف ہو کر اپنا مہینے بھر کا پروگرام ڈراپ کر کے واپس آ کر۔

کہہ رہا تھا کہ وہ شائی کو اپنے اوپر مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا!

کتنا سیدھا تھا! وہ تو مسلط ہو چکی تھی۔ پورے شدومد سے!

ایک نازک سی چھوٹی سی لڑکی اس اونچے لمبے چوڑے آدمی کو ڈھا چکی تھی، مغلوب کر چکی تھی۔

اور یہ تھا کہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ شاید آج سے قبل اس کیلئے اپنے اندر پلتی بے تحاشہ نفرت کے سبب، شاید شائی کا اسے یوں بے دردی سے رد کر دینے کے سبب!

مگر۔۔۔ شائی نے بھی تو اسے جن الفاظ میں مسترد کیا تھا۔ وہ نازیبا تھے۔ وہیں سے اسے اپنی ولدیت کا پتہ چلا تھا اور۔۔۔ اسی وجہ سے اسکی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ پر۔

اس وقت خود وہ اسکی وہی بات Justify کر رہا تھا۔ سچ کو سچ تسلیم کر رہا تھا۔ حقیقت کو حقیقت مان رہا تھا۔

یہ بھی ایک خوش آئند تبدیلی تھی کہ وہ۔۔۔ اپنی ولدیت سے متعلق اس تلخ حقیقت کو قبول کر رہا تھا۔

گویا شائی میں دلچسپی لینے سے وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنی پچھلی کمزوریوں کو بھلا دے اور اپنے وجود اپنی ہستی سے سمجھوتہ کر لے۔

دوسرے لفظوں میں اپنی تخلیق کی قدر کرے کہ۔

اسے بھی اپنے خالق نے تخلیق کیا تھا!

وہ اس دنیا میں اپنے پیدا کرنیوالے کی مرضی سے آیا تھا!

اور اسی لئے اسے بھی اس دنیا میں اسی طرح جینے کا بھرپور حق حاصل تھا جسطرح ایک جائز اولاد کو حق حاصل ہوتا ہے۔

فاروق مطمئن نظر آنے لگا۔

تبھی آفس کا چپڑاسی ان کیلئے ٹھنڈی یخ پیپسی لے آیا۔

اپنے اپنے گلاسوں میں سے پیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ فاروق کے گھر والوں سے متعلق کچھ یہاں کی گرمی کے بارے میں۔

"اچھا۔۔۔ اب چلونگا۔ سخت تھکا ہوا ہوں۔ نہاؤنگا اور خوب سوؤنگا"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور ہاں۔ یہ تو بتانا ہی بھول گیا۔ ہارون بھائی کی منگنی ہے آنیوالے جمعرات کے دن..."

"اس گرمی میں"۔

"گزارا ہو جاتا ہے۔ تم ٹھنڈی جگہ سے آ رہے ہو اس وقت ایسا ہی لگے گا۔ ٹھیک ہو جاؤ گے کل تک"۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

"او کے۔ چلتا ہوں۔ نانو بہت یاد آ رہی ہیں"۔

''وہ بھی تمہیں بہت مس کرتی ہیں۔تقریباروزان سے فون پر بات ہوتی ہے۔کہتی ہیں شاہ جان سے فون پرتوبات ہوتی ہے مگر کلیجے میں ٹھنڈتب پڑتی ہے جب اسے سینے سے لگاتی ہوں''۔

''نانوتو میری نانو ہیں''۔اسکے لب ولہجے میں نانو کیلئے محبت وعقیدت کاایک جہان آباد تھا۔

''اچھا۔۔۔ خداحافظ''۔وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

''اوروہ...''۔

فاروق نے اسے پھرروک لیا۔

''کیا؟''اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

''اس...اس معاملے کا کیا ہوگا''۔فاروق کواس کیلئے شائی بہت اچھی لگتی تھی اپنی خواہش دبا نہ سکا

''ون سے معاملے کا''۔

''یہی۔۔۔ شائی کا''۔

وہ اسکی بے تابی پرمسکرادیا۔

''چھوڑویار۔ختم ہوگئی بات۔'' کہتے کہتے وہ دروازے سے باہرنکل گیا۔

بات ختم نہیں ہوئی تھی۔۔۔ شہباز خان نے اس سے قبل کبھی کسی لڑکی سے ایسی شکست نہیں کھائی تھی۔ایسا مغلوب نہیں ہواتھا کہ راتوں کی نیند گنوابیٹھتا!

یہ الگ بات تھی کہ وہ مان نہیں رہ

مسکراتے ہوئے وہ اپنی کرسی پر بیٹھا اوراپنے سامنے کھلی فائیل پرایک بار پھر سے نظریں دوڑانے لگا۔

آج پھر ہرسوبادل چھائے ہوئے تھے۔بوندا باندی بھی ہورہی تھی۔مٹی کی سندھی سوندھی خوشبواٹھ رہی تھی۔

چاروں اور ہریالی تھی،اونچے نیچے ٹیلے ہرے بھرے تھے،نیچی نیچی پہاڑیاں سرسبز وشاداب تھیں مگر۔۔۔ گرمی پھربھی اپنی جگہ تھی۔

نانو شہباز خان کاڈاکٹر سے چیک اپ کرواکراسے آفس میں چھوڑتے ہوئے خودگھر واپس آرہی تھیں۔

خوش تھیں بہت،مطمئن۔۔۔ کہ ڈاکٹر نے کہا تھا شہباز خان اب ٹھیک تھا۔کچھ دوائیں البتہ جاری رکھنے کوکہا تھا۔

'بیگم صاحبہ۔اب آپ شہباز خان کی شادی کرادیں۔اس سے بہتراورکوئی علاج نہیں' مسکراکر کہتے ہوئے ڈاکٹر کی بات باربارانکے کانوں میں گونج رہی تھی۔

خوش آئند سوچوں میں گم وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔

گاڑی پکی سڑک چھوڑکردائیں جانب شنگل روڈ پر ہولی تو وہ چونکیں۔

دونوں طرف تاحدنظر ہرے بھرے کھیت تھے۔دائیں جانب کھیتوں کے اس پارا یکڑوں پر پھیلا مالٹوں کا باغ تھا۔یہاں وہاں گھنے سایہ دار درخت تھے۔انکے بیچوں بیچ چلتی بل کھاتی سڑک سامنے سرسبز ٹیلے پرواقع پتھروں کے بنے انکے قلعہ نما کوٹھی تک جاتی تھی۔

شہباز خان کے نانا کی وفات کے بعد بزنس سنبھالتے انہوں نے مستقل یہاں آنے کا ارادہ کیا تورہنے کیلئے شہر کے ہنگاموں سے دور مضافات میں یہ جگہ پسند کرلی۔

یہاں ان ہرے بھرے ٹیلوں اورنیچی نیچی گہری سبز پہاڑیوں کے دامن میں یہ قلعے جیسی

مضبوط محل نما کوٹھی تعمیر کروائی اور ہمیشہ کیلئے یہاں آن بسیں۔

وسیع و عریض کوٹھی کے اردگرد ایکڑوں پر پھیلے انہوں نے ٹینس کورٹ، سوئمنگ پول، سٹڈ فارم اور شوٹنگ رینج بنوائے تھے۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں ایک نہ ایک دن انکا شاہ جان ضرور وطن واپس آئیگا۔ اور اسے ان سب چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

چوڑے خوبصورت کارپورٹ میں گاڑی رکی تو مستعدی سے پچھلی طرف آتے ہوئے باوردی شوفر نے ان کیلئے دروازہ کھولا۔

اپنے بیڈروم میں پہنچتے ہی انہوں نے اسماعیل بابا کو بلوالیا۔

نرم و گداز صوفے پر نیم دراز وہ آہستہ آہستہ سیب کا جوس پی رہی تھیں۔ کچھ سوچتی آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ جل رہے تھے۔

''پتہ ہے اسماعیل ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا''۔

''جی بیگم صاحبہ''۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔

''کہہ رہا تھا شہباز خان کی شادی کرادیں اس سے بہتر اور کوئی علاج نہیں''۔

''آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی بیگم صاحبہ''۔ اسماعیل بابا عرصہ بعد بہت خوش دکھائی دینے لگے۔ ''میں تو خود یہ ذکر آپ سے چھیڑنے کا سوچ رہا تھا۔ دراصل وہ... وہاں...'' وہ کچھ ہچکچا گئے۔

''بولو اسماعیل''۔ انہوں نے انہیں ہمت دلائی۔

''وہ... وہاں پہاڑ پر ایک لڑکی خواہ مخواہ چھوٹے سرکار کے پیچھے لگ گئی تھی۔ وقت بے وقت آن ٹپکتی تھی سیدھے سرکار کے کمرے میں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ بہت آزاد تھی، بہت بے باک۔ توبہ... توبہ...''۔ اسماعیل بابا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

نانو چونک اٹھیں۔ سیدھی ہو بیٹھیں۔

''کون تھی؟ کیا شاہ جان بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا''۔

''میرا خیال نہیں۔ بلکہ آخری دنوں میں تو لگتا تھا سخت بیزار تھے اس سے...''۔

''یہ اچھا ہوا۔ آزاد اور بے باک لڑکیاں مجھے قطعاً پسند نہیں۔ مجھے تو بس سیدھی سادی، شرماتی لجاتی بہو اچھی لگتی ہے''۔

''وہ... اجازت ہو تو ایک عرض کروں بیگم صاحبہ۔

''بولو۔ آج ضرور بولو۔ میں بہت خوش ہوں''۔

''وہاں ایک اور لڑکی تھی۔ بلکہ اسی لڑکی کی پھوپھی زاد تھی مگر____ زمین آسمان کا فرق تھا دونوں میں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ اور صورت کیساتھ سیرت اللہ میاں نے ایسی دی تھی کہ سبحان اللہ۔ میں تو چھوٹے سرکار کیلئے بس اسی کے خواب دیکھتا ہوں۔ پڑوس میں سویٹ تھا مگر مجال ہے کوئی ایسی حرکت کی ہو جس سے ہمارے سرکار متوجہ ہوئے ہوں۔ وہ تو بالکل پہلو میں یوں رہ رہی تھی جیسے آس پاس کوئی موجود ہی نہ ہو۔ بڑی حیا والی تھی بیگم صاحبہ۔ اس زمانے میں ایسی لڑکی کا ملنا مشکل لگتا ہے...''۔

نانو توجہ اور دلچسپی سے انکی بات سن رہی تھیں۔ چہرے اور آنکھوں سے اشتیاق ہویدا تھا۔

''تم نے تو یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے اسکا شیدائی بنادیا۔ کون ہے یہ لڑکی۔ کچھ اتہ پتہ تو کیا ہوتا...''۔

دفعتاً وہیں صوفے کے سائیڈ پر رکھی ٹیبل پر پڑے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر نانو نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کان سے لگالیا۔

فاروق تھا۔ اسے معلوم تھا آج وہ شہباز خان کو چیک اپ کیلئے لے کر گئی تھیں۔ اسی سلسلے میں فون کیا تھا۔

''ہاں بیٹا۔ ڈاکٹر کہتا تھا بالکل ٹھیک ہے اب۔ اور پتہ ہے کیا کہتا تھا؟ کہتا تھا اسکی شادی کرادیں اس سے بہتر کوئی علاج نہیں''۔

''ٹھیک کہتا تھا نانو۔ اب اسکا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جانا چاہیئے''۔

''یہی بات کرنے تو میں نے اسماعیل کو اپنے پاس بٹھایا ہوا ہے۔ کہتا ہے ایک لڑکی پہاڑ پر قریب کے سویٹ میں رہتی تھی۔ بہت خوبصورت تھی اور سیرت کی بھی بہت تعریفیں کر رہا

ہے...‘‘۔

’’نانو اسماعیل بابا ہیں؟‘‘ فاروق نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں ہے۔ کیوں؟‘‘

’’نانو ذرا ضروری بات کرنی تھی ان سے‘‘۔

اور نانو نے ریسیور اسماعیل بابا کو تھما دیا۔

’’بات کرو فاروق سے‘‘۔

’’جی صاحب‘‘۔ بابا ماؤتھ پیس میں بولے۔

’’بابا پہاڑ پر قریب کے سویٹ میں رہنے والی لڑکی کا اتہ پتہ تو نانو کو نہیں بتا دیا‘‘۔ وہ خاصا پریشان لگ رہا تھا۔

’’نہیں صاحب۔ ابھی تو نہیں بتایا‘‘۔

فاروق کی جان میں جان آگئی۔

’’بالکل مت بتائیں۔ گول کر جائیں۔ سمجھ گئے نا آپ۔ وجہ ملنے پر بتاؤنگا‘‘۔ اس نے ایک ہی سانس میں بات کہہ ڈالی۔

کہیں نانو کو پتہ چل جاتا کہ شہباز خان اتنے دن شائی کے قریب رہ رہا تھا تو انہیں سخت صدمہ ہوتا۔ اسی کی وجہ سے تو شہباز خان مرتے مرتے بچا تھا۔

’’ٹھیک ہے صاحب۔ اور کوئی خدمت‘‘۔

’’بس یہی کہنا تھا اب فون نانو کو دے دیں‘‘۔

اور نانو ان دونوں کی گفتگو کو کوئی خاص اہمیت دیئے بنا دوبارہ بابا سے باتیں کرنے لگیں۔ کہ فاروق اکثر اسماعیل بابا کو شہباز خان کیلئے پیغام دیتا رہتا تھا۔

سیاہ گھٹائیں امڈی چلی آرہی تھیں۔ نرم خرام ہوا ہریالیوں میں سرسرانے لگی تھی، وقت سے پہلے ہی شام کے اندھیرے گھمبیرے ہو رہے تھے۔

کوٹھی کے پچھواڑے دور سرسبز پہاڑی کے دامن میں بنے خوبصورت سوئمنگ پول میں شہباز خان لیمپ پوسٹس کی مدھم روشنیوں میں کافی دیر سے سوئمنگ کر رہا تھا۔

اوپر پہاڑی کے جنگل میں شام بسیرا کرنے لگی تھی۔ سرمئی اور چمپئی اندھیرے اجالے آپس میں مدغم ہو رہے تھے۔ نیچے تالاب کے آس پاس موتیا کے پھولوں کی اترتی بہار کی مہک مدھر ہوا کے دوش پر اڑتی دل و دماغ کو معطر کیئے دے رہی تھی۔

تبھی وہاں فاروق چلا آیا۔ اپنے بھائی ہارون کی منگنی کا باقاعدہ بلاوا دینے۔

وہیں تالاب کے کنارے خوبصورت دھاری دار چھتری کے نیچے لگی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اسکے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

شہباز خان اسے دیکھ کر کنارے پر آگیا۔ پھر قریب کے کیبن میں جا کر صاف پانی کا شاور لیا اور باتھ روب پہنتے ہوئے اسکے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

’’یہ بادل برسیں گے‘‘۔ فاروق گھنگھور گھٹاؤں پر نظریں جماتے ہوئے بارش کے خوش آئند تصور کے تحت خوشگواری سے بولا۔

’’نہ برسے تو‘‘۔ شہباز خان نے اسے چڑایا۔

’’برسیں گے‘‘۔

’’انشاء اللہ بولو‘‘۔

’’انشاء اللہ۔ انشاء اللہ‘‘۔ فاروق کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

تبھی باوردی بیرا ان کیلئے سٹیمڈ گلاسز میں ہینڈ میڈ آئسکریم اور کرسٹل کے خوبصورت پلیٹر میں ڈھیر سارے ٹھنڈے میٹھے آم لے آیا۔

’’یہ ہوئی نا بات‘‘۔ فاروق خوش ہوتے ہوئے بولا۔

’’سنا ہے ڈاکٹر نے کہا ہے تمہاری شادی کرادی جائے اس سے بہتر کوئی علاج نہیں‘‘۔

فاروق نے آئسکریم سے ابتدا کی۔

شہباز خان کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''نانو نے بتایا ہوگا''۔

''ہاں۔اور پتہ ہے آج بال بال بچے ہو''۔

''کیسے؟''

''ہوا یوں کہ میں نے صبح نانو کو فون کیا کہ پتہ کرلوں تمہارا چیک اپ ہوا ہے ڈاکٹر کیا کہتا تھا۔معلوم ہوا نانو اور اسماعیل بابا بیٹھے ہیں اور تمہاری شادی کا ذکر خیر ہو رہا ہے۔ساتھ میں یہ بھی کہ اسماعیل بابا نانو کو بتا رہے تھے کہ پہاڑ پر تمہارے قریبی سویٹ میں انہوں نے تمہارے لئے ایک نہایت عمدہ لڑکی پسند کی ہے۔مگر ابھی نانو کو یہ نہیں بتایا کہ اس کا اتہ پتہ کیا ہے۔میں نے فوراً نانو سے اسماعیل بابا کو فون دینے کو کہا اور عین وقت پر انہیں اس لڑکی کا اتہ پتہ بتانے سے روک دیا کیونکہ وہ لڑکی شائی تھی...''۔

''اوہ''۔شہباز خان نے نجات کی سانس لی۔''اچھا کیا ورنہ نانو کا اشتعال اور بڑھ جاتا''۔

''تو تم چاہتے ہو کہ نانو کا اشتعال اور نہ بڑھے''۔فاروق نے الٹا اسے گھیر لیا۔'اور نہ بڑھے' پر خاصا زور دیا۔

وہ ہنس دیا۔خوشدلی سے۔

''ہاں''۔

''اسکا مطلب ہے تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ ساتھ نانو بھی اسے پسند کریں''۔

''میں ___ اسے پسند کرتا ہوں''۔اس نے آئسکریم کا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب چھوڑ و نا۔گلاس واپس اٹھالو''۔

شہباز خان ایک بار پھر ہنس دیا۔دلآویزی سے۔گلاس بھی واپس اٹھالیا۔

''ویسے ایک بات ہے... آفس میں کام کرتے کرتے میں... چونک جاتا ہوں۔بے انتہا معروفیت کے باوجود... اسکا خیال آجاتا ہے...''۔وہ بات کو چبا چبا کر بولا۔

اسکی دلنشیں آنکھوں میں شوخی تھی، پرکشش ہونٹ ہنسی کا بار اٹھانے سے قاصر لگ رہے

تھے۔

''اور پتہ ہے کیا؟''

''کیا؟''

''اسکو محبت کہتے ہیں''۔

''نہیں خیر''۔وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے آئسکریم کھانے لگا۔

فاروق جھنجھلا اٹھا۔کسی طرح مانتا ہی نہیں تھا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو''۔

شہباز خان کا ایک اور زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''اچھا سنو۔اس کی کزن کا فون آیا تھا۔بلکہ یہ تیسرا چوتھا فون ہے اسکا...''۔

''کیا کہتی ہے''۔

''یہی کہ ___ میں ___ یوں ہی چھوڑ کر چلا آیا۔اور وہ اب وہاں سے واپس آچکی ہے۔اور وہ مجھے بار بار فون [illegible] رہی ہے اور میں نے ایک بار بھی فون نہیں کیا وغیرہ...''۔

''تم نے اسے بتا [illegible] بس کہ یہ تو تم اپنا غم غلط کرنے کیلئے اس سے گپ شپ کرتے تھے''۔

''کیسا غم؟''

''شائی کا اور کیسا غم''۔

اور شہباز خان نے ایک گہری سانس لی۔فاروق کی سوئی شائی کے ہی گرد گھوم رہی تھی۔

''تم ___ یہ بات بھول نہیں سکتے''۔

''پہلے تم بھول جاؤ ___ پھر میں بھول جاؤنگا''۔

شہباز خان مسکرادیا۔ہولے سے۔

''آج ___ صبح ہی وہ مجھے خواب میں نظر آئی تھی...''۔آئسکریم کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

اسکی دھر مسکراہٹ گہری ہو چلی تھی۔

فاروق نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے آموں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ناراض ہوگیا تھا اسکی ڈھٹائی پر غالباً۔

"تم نے کچھ کہا نہیں"۔ اسے خاموش پا کر اس نے اسے چھیڑا۔

"آم کھاؤ گے میٹھا ہے"۔ اس نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"پوچھو گے نہیں کہ میں نے اسے کیسے دیکھا"۔

"نہیں۔ تم جھوٹ بہت بولتے ہو"۔

"خواب کے متعلق جھوٹ نہیں بولا جاتا"۔ وہ سیریس ہوگیا۔

"سناؤ پھر"۔ کٹے ہوئے آم کی پلیٹ اسکی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اپنے لئے دوسرا کاٹنا شروع کردیا۔

"بس وہی ـــــ کبھی ایک جگہ پھولا پھولا منہ لئے کھڑی ہے کبھی دوسری جگہ منہ بسورتی روٹھی روٹھی شکل لئے بیٹھی ہے..."۔

"اسکا مطلب ہے وہ تم سے خفا ہے"۔

"لگتا تو یہی تھا"۔

"منا کیوں نہیں لیتے اسے"۔ اس نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

"سچ بتاؤں"۔

"ہاں"۔

"I like her, but..."

"مگر کیا؟"

"وہی اسکا انکار ـــــ اور انکار سے بڑھ کر وہ بات جو اس نے میرے متعلق کہی تھی"۔

ایک بار پھر وہ اداس اور تلخ لگنے لگا۔

"وہ اس نے بہت پہلے کہا تھا۔ تب وہ تم سے ملی نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے تمہیں دیکھا نہیں تھا۔ اب وہ تمہیں پسند کرتی ہے اور پیار میں انسان ہر بات کو بھول جاتا ہے"۔

"نہیں۔ انکار کرنے کا اسے حق پہنچتا تھا مگر مجھے گالی دینے کا اسے کوئی حق نہیں تھا"۔

"معاف نہیں کر سکتے اسے"۔

"مشکل ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں نے اس پہلو پر سوچا نہیں۔ وہ بار بار یاد آنے لگی تو میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس کی بات بھول جاؤں مگر ـــــ پھر غیرت آڑے آئی... ہونہہ"۔ وہ تلخی سے مسکرایا۔ "اب تم سوچو گے کہ ایک ناجائز اولاد کو غیرت زیب نہیں دیتی۔ مگر کیا کروں۔ کہ اسکے باوجود مجھ میں غیرت ہے، خودداری اچھی لگتی ہے، عزت کا متلاشی ہوں"۔ اسکے لہجے میں بے بسی انتہاء پر تھی۔

فاروق کو کئی بار پہلے کی طرح اس وقت پھر اس پر ترس آیا۔ دکھی ہوگیا وہ بھی۔

"میں ہرگز ایسا نہیں سوچونگا"۔ مجھے ہمیشہ تمہاری غیرت اور خودداری پر فخر رہا ہے۔ اسی لئے تمہیں خدا نے بے اندازہ عزت دے رکھی ہے۔ اگر شائی کے بارے میں تمہارا فیصلہ اٹل ہے تو میں آئندہ اسکا ذکر نہیں کرونگا۔ میرے لئے وہ تم سے تو زیادہ اہم نہیں"۔

شہباز خان چند ثانیے خاموش رہا۔

سیاہ گھنیرے بادلوں میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ پھر ـــــ

"تم سے میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ آج تمہیں بتاتا ہوں کہ ـــــ وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ بہت زیادہ۔ بلکہ بعض اوقات تو صرف اسے ہی سوچے جانے پر میں اپنے آپکو بے بس پاتا ہوں۔ کبھی کبھی بے اختیار دل چاہتا ہے سب بھول بھال کر اسے جا کر مل لوں۔ کوشش کے باوجود میں اسکے خیال سے چھٹکارا نہیں پا پاتا"۔ وہ بے بسی سے مسکرایا۔ "اگر اسے محبت کہتے ہیں تو پھر ـــــ مجھے ـــــ اس سے واقعی محبت ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی دیر کو میں اپنی سوچوں پر قابو پا بھی لیتا ہوں۔ اس وقت لگتا ہے کیا بیوقوفی ہے سب۔ اور بڑا ریلیکس بھی محسوس کرتا ہوں مگر ـــــ دوسرے ہی لمحے وہ غالب آجاتی ہے۔ ذہن دوبارہ اسکی طرف پلٹ جاتا ہے"۔

"اور دل بھی"۔

"ہاں شاید"۔ دلآویزی سے مسکراتے ہوئے اس نے اب بھی جیسے جھجکتے جھجکتے اپنی محبت کا اقرار کیا۔

"شاید نہیں۔ صرف ہاں کہو"۔

وہ ہنس دیا۔ مدھر ہنسی۔

"ہاں"۔ وہ دھیرے سے بولا۔

"اب ہوئی نا مردوں والی بات"۔ فاروق خوش ہو گیا۔

"پہلے کیا میں عورتوں والی باتیں کر رہا تھا"۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"نہیں خیر ایسی بات بھی نہیں ہے مگر پیار چھپانا بھی کوئی اچھی حرکت نہیں"۔

"ویسے پہلے میں ذرا Sure بھی نہیں تھا۔ یوں ہی مذاق لگ رہا تھا سب"۔

"اور اب"۔

"جب بالکل بے بس ہو گیا ہوں تو یقین ہو گیا ہے"۔

"اب میں بات آگے بڑھاؤں گا"۔

"نہیں ـــ بات آگے نہیں بڑھے گی"۔ وہ اچانک سنجیدگی سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے وہ اچھی لگتی ہے یہ کافی ہے"۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا"۔

"بس یہ کافی نہیں کہ وہ مجھے پسند ہے۔ Rather I Love her."

"اگر اتنا ہے تو بات یہیں کیسے ختم ہو سکتی ہے"۔

"ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ بھول جاؤں گا آہستہ آہستہ۔ مگر ـــ نہیں"۔ اس نے بے کلی سے سر جھٹکا۔ "تم جانتے ہو اچھی طرح۔ میں بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔ معلوم ہے تمہیں وجہ اچھی طرح..."۔

اور فاروق نے گہری سانس لی۔ اس سے سر ٹکرانا بے سود تھا!

"یہاں کا موسم مجھے پسند ہے۔ ذرا گرمی بڑھی، جھوم کے آئے بادل اور ٹوٹ کے برسا پانی"۔ فاروق نے باتوں کا رخ بدل دینا ہی مناسب سمجھا۔

"اب بھی بس برسنے کو ہیں یہ بادل"۔ شہباز خان نے منڈلاتی سیاہ بدلیوں پر نگاہ کی۔

معاً بجلی کڑکی ـــ اور پل میں ہی زور کی گرج ہوئی۔

"یار میں چلوں گا اب۔ دو چار گھروں میں ابھی اور بھی کہنا ہے ہارون بھائی کی منگنی کا"۔ فاروق نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"جمعرات شام سات بجے نا"۔ شہباز خان نے کنفرم کرنا چاہا۔

"ہاں"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "بائے۔ سی یو"۔

"بائے"۔

فاروق چل دیا۔

شہباز خان بھی اندر آ گیا۔

واقعی جھومتے بادل برسے اور ٹوٹ کر برسے۔

گھنے قد آور درخت بارش کی جل تھل سے زمین بوس ہو رہے تھے، تڑپتی بجلیاں یہاں سے وہاں تک پورے علاقے کو روشن کر جاتی تھیں، بادلوں کی گرج دل ہلا دینے والی تھی۔

بجلی کبھی کی جا چکی تھی۔ ہر سو مکمل بلیک آؤٹ تھا۔

وہ اور نانو بڑی بڑی موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر کر رہے تھے۔

حسب معمول اسکی پسند کے کھانے بڑے سے ڈائننگ ٹیبل پر چنے تھے۔ نانو جیسے واقعی اسی کیلئے جی رہی تھیں۔ جب سے وہ آیا تھا۔ ہر بات ہر کام میں اسی کی پسند ملحوظ رکھی جاتی تھی۔

"یہ روسٹ دو شاہ جان کو"۔ انہوں نے لیمب لیگ کی طرف اشارہ کیا۔

اور بیرے نے مؤدب طریق سے حکم کی تعمیل کی۔

جانے کیوں شہباز خان کچھ چپ چپ سا کھانا کھانے میں مصروف تھا۔

بیر... میٹھا سرو کیا تو نانو نے اسے خاموشی سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

''شاہ جان۔ چپ چپ کیوں ہو''۔ نانو نے متفکر انداز میں پوچھا۔

''نہیں تو۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں بالکل''۔ یکدم ہی اسے احساس ہوا کم از کم نانو کی موجودگی میں اسے اپنے آپ میں ہونا چاہیئے تھا۔ ورنہ وہ بے طرح پریشان ہو جاتی تھیں۔

''مجھے لگا تم کچھ پریشان سے ہو''۔

''نہیں نانو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ وہ بشاشت سے بولا۔

چند لمحے وہ چپ رہیں، کچھ سوچتی رہیں۔

''اسماعیل بتاتا تھا پہاڑ پر تمہارے بالکل قریب والے سویٹ میں ایک لڑکی ٹھہری تھی...''۔

اچھا تھا فاروق سے اسے ساری بات کا پتہ چل گیا تھا۔ اسلیئے کوئی مشکل نہیں پڑی۔

''ہو گی۔ میں نے غور نہیں کیا۔ کیوں؟''

''کہتا تھا بہت خوبصورت تھی اور بہت اچھی بھی''۔

وہ مسکرادیا۔ ہولے سے۔

''تو''۔

''سوچتی ہوں اتہ پتہ کرلوں۔ دیکھ آؤں جا کر''۔

''کس لئے؟'' وہ نانو سے یوں ہی لاڈ کیا کرتا تھا۔

''تمہارے لئے اور کس لئے''۔

''نانو آپکو اچھا نہیں لگتا میں یوں ہی صرف اور صرف آپکا رہوں''۔

''بس۔ اور بہانے نہیں چلینگے۔ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔ مجھے بھی تمہاری اولاد کی خواہش ہے''۔

اور حسب معمول شہباز خان کی زبان پر آتے آتے رہ گیا۔

''ایک حرام کی اولاد کی اولاد حرامی کی اولاد کہلائے گی۔ کیا میں اپنے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کو بھی یہ سب سننے کی سزا دوں...''۔

پر اس نے بات اندر ہی روک لی۔ وہ ایک بار پہلے بھی وہ یہ بات نانو کے گوش گزار

کر چکا تھا۔ اور جسے سنکر نانو بہت دکھی ہو گئی تھیں۔ وہ انہیں اور دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ بہت اچھے موڈ میں تھیں۔

اپنے ساتھ ساتھ اسے نانو کو دکھی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا!

''مجھے سوچنے دیں نانو''۔

''بس بہت سوچ لیا تم نے۔ اب مجھے فیصلہ کرنے دو''۔ نانو نے فیصلہ سنا دیا۔ ''سب سے پہلے میں اسماعیل کی بتائی ہوئی لڑکی کو دیکھنے جاؤنگی''۔

باپ رے۔ وہ گھبرا گیا۔

''اب ـــ اس وقت تو آپ چلیں میں آپکو آپکے کمرے میں چھوڑ آؤں''۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو''۔ وہ بھی اٹھیں۔ ''مگر اب کے میں سنجیدہ ہوں اس معاملے میں''۔

اور وہ کوئی جواب دیئے بنا انہیں انکے بیڈروم کی طرف لے چلا۔

حسب عادت صبح ہی صبح اسکی آنکھ کھلی۔ نظر چوڑی خوبصورت بالکنی میں لگے ڈھیروں تروتازہ سرخ عنابی پھولوں سے ہوتی سامنے قریب کی گہری سبز پہاڑی پر پڑی۔

صبح صادق کی سپیدی میں گھنی ہریالی آنکھوں کو سکون بخش رہی تھی۔ لہلہاتی ہریالی میں سے ہوتی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی اوپر پہنچ کر پچھلی ڈھلان میں اوجھل ہو رہی تھی اور۔

اس طرف نیچے دامن میں یہاں وہاں اگے درختوں کے درمیان ایستادہ سرخ سنہری نارنجی شعلہ نما پتوں والا درخت نظروں کا مرکز بن رہا تھا۔

وہ خوبصورت سماں آنکھوں کے راستے من میں اتارنے لگا۔

"سب سے پہلے میں اسماعیل کی بتائی ہوئی لڑکی کو دیکھنے جاؤنگی"۔ نانو کے الفاظ اسکے کانوں میں گونجے۔

باپ رے۔ وہ ہڑبڑا اٹھا۔

وہ اسماعیل بابا کو منع کریگا کہ انہیں شائی کا اتہ پتہ نہ بتائیں۔ لیکن ــــ

وہ شائی کو پسند بھی تو کرتا تھا، دل نے کہا۔

ہاں مگر ــــ شادی کا تو اسکے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے اسے بہت گندے الفاظ سے نوازا تھا۔ پر۔

کیا یہ حقیقت نہیں تھی؟

پرودگار! یہ کتنی تلخ حقیقت تھی!

وہ اتنی تلخیوں میں کیسے جی پائیگا؟

یہ زہر بہت کڑوا تھا گھونٹ گھونٹ کر کے کیسے نگل پائیگا؟

جینا ایک عذاب تھا کیسے جھیل پائیگا؟

یہ سزا بہت کڑی تھی مالک!

بے قراری سے اس نے سر تکیوں میں دے دیا۔ آنکھیں میچ لیں اور ــــ سر بانہوں میں لے لیا۔

"ٹررن... ٹررن"۔ دفعتاً بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے اسکے پرائیوٹ نمبر کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس وقت کون ہو سکتا تھا!

ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"شہباز ہیئر"۔ وہ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے ماؤتھ پیس میں بولا۔

نادیہ تھی۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ یہ نمبر اس نے کیسے حاصل کر لیا تھا؟ اس وقت وہ بات کرنے کی حالت میں بالکل نہیں تھا۔

"کیا بات ہے"۔ وہ بے دلی سے بولا۔

"کوئی خاص نہیں۔ آنکھ کھلتے ہی یاد آئے کر لیا فون"۔

"تمہیں معلوم ہے ٹائم کیا ہے"۔

"ہاں۔ ساڑھے چار ہیں"۔

"دیکھو۔ میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں..."۔

"ایک تو آپکی نماز..."۔

"آگے ایک لفظ بھی مت کہنا..."۔ وہ آپے سے باہر ہونے لگا۔

تنقید اور وہ بھی اسکی نماز پر؟ اپنے پروردگار سے ہمکلام ہونے پر؟ اس نے اسکی زندگی کے اہم ترین پہلو پر چوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

کھڑاک سے اس نے ریسور کریڈل پر رکھ دیا۔

بستر سے اٹھ آیا۔

"ٹررن... ٹررن"۔ پھر گھنٹی بجی۔

"کیا ہے؟" اسکا موڈ اب بھی بگڑا ہوا تھا۔

"آئی ایم ریلی سوری شہباز"۔ وہ سہمی ہوئی بھی تھی۔

"ہوں۔ کیا ہے"۔

"مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے"۔

"اس وقت نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ بعد میں بات ہوگی"۔

"پھر آپ نہیں کرتے"۔ نادیہ جانتی تھی اب بات کرلی تو کرلی ورنہ بعد میں اسکا ہاتھ آنا مشکل ہوتا تھا۔

"پلیز نادیہ۔ میں نماز قضا نہیں کرنا چاہتا"۔ ساتھ ہی اس نے ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا۔

حسب معمول نماز کے بعد دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو تہہ دل سے اپنے خالق سے اپنے سکون کی دعا مانگی۔

فارغ ہی ہوا تھا کہ پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

پھر نادیہ تھی۔ پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ بولو"۔ وہ خود کو سنبھال کر بولا۔

"مجھے ملتے کیوں نہیں"۔ اسکے لہجے میں بے صبری تھی۔

"وقت نہیں ملتا"۔ وہ مختصراً بولا۔

"پہاڑ پر تو وقت نکالتے تھے"۔

"وہاں وقت ہی وقت تھا"۔

"اب بھی نکالیں پلیز!"

وہ تو دن بدن سیریس ہوتی جا رہی تھی۔

کیا اسکا رویہ اس کیلئے کافی نہیں تھا؟ وہ جھنجلا سا اٹھا۔

"مشکل ہے"۔

"مشکل نہیں ہے"۔

"واقعی بالکل وقت نہیں ملتا۔ بہت کام ہوتا ہے"۔

"کام مجھ سے ضروری ہیں"۔

جانے کس غلط فہمی میں تھی وہ!

"ہاں"۔

ایک پل کو وہ چپ سی رہ گئی۔

"میں آپکو اچھی نہیں لگتی"۔

"ایسی بات نہیں ہے"۔

"میں آپکو یاد نہیں آتی"۔

وہ مسکرا دیا۔ خالی خالی سا۔

"تم ٹھیک ٹھاک ہو یاد آنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"آپ بات کو ٹال رہے ہیں"۔

"کیا کہوں"۔ وہ عاجز سا آنے لگا۔

"میں آپکے بارے میں بہت آگے نکل آئی ہوں۔ آپ کسی طرح سیریس ہی نہیں ہوتے کہ آپ سے بات ہو"۔

"کیا مطلب؟"

"I Love you Shahbaz. میں آپکے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی"۔ اس نے کہہ دیا۔۔۔ کہ

واقعی شہباز خان کسی طرح اسکی بات کو اہمیت دے ہی نہیں رہا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ برابر فون کر رہی تھی۔ ایک بار بھی اس نے کال بیک نہیں کیا۔ ملنے سے بھی کترا رہا تھا۔ مجبوراً اسے اپنی مدعا فون پر ہی کہنا پڑی۔

شہباز خان پہلے ہی پریشان تھا۔ اوپر سے صبح صبح وہ اسے مزید پاگل کیئے دے رہی تھی۔

"شہباز کچھ بولیں نا۔ میں مر جاؤں گی شہباز"۔

'گلیمر... سٹیٹس...'۔

وہ تلخی سے مسکرایا۔

'یہی تو ہے سب کچھ۔ بڑے سے بڑے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں'۔ اسکے پہاڑ پر کہے الفاظ اسکے کانوں میں گونجے۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا"۔ وہ بڑے ضبط سے بولا۔

وہ تڑپ اٹھی۔

"شہباز آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے"۔

"اوہ۔۔۔ میں نے تمہیں صرف ایک دوست سمجھا تھا اور بس"۔

"لیکن میں آپکو اپنا سب کچھ مان چکی ہوں"۔

"بیوقوفی ہے تمہاری"۔

"پلیز شہباز"۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں"۔

"میں آپکو اچھی نہیں لگتی؟"

"تم۔۔۔ اچھی لڑکی ہو مگر۔۔۔ میرا آئیڈیل کوئی اور ہے"۔ جانے کیسے اس کے منہ سے نکل گیا۔

"شائی"۔ وہ بلا تامل بولی۔

وہ چپ سا رہ گیا۔ اسکو کیسے معلوم ہوا؟

پھر وہ سنبھلا۔ جب اس نے شائی سے مزید تعلق ہی نہیں رکھنا تھا تو خواہ مخواہ اقرار کیوں کرتا؟

"نہیں"۔

"مجھے معلوم ہے وہ آپکی آئیڈیل ہے۔ آپکا رشتہ لینے جو عورت وہاں گئی تھی اس نے یہی

کہا تھا کہ آپ نے اسے امیریکہ میں دیکھا تھا اور اپنے لئے پسند کیا تھا..."۔

اوہ۔۔۔ تو وہ تمام واقعہ سے واقف تھی! شائی نے سب بتایا ہوگا اسے یقیناً!

"پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسکے فادر نے معذرت کرلی تھی اور۔۔۔ اور شائی نے مجھے حرام کی اولاد کہہ کر Refuse کر دیا تھا"۔ وہ ایک ہی سانس میں بولا۔

اسکے لہجے میں بلا کا طنز تھا، ڈھیر ساری تلخی تھی، زہر تھا!

"لیکن۔۔۔ مجھے اسکا یہ کڑوا سچ تمہارے میٹھے جھوٹ سے کہیں زیادہ اچھا لگا ہے۔ وہ بولڈ ہے۔ میرے گلیمر سے متأثر نہیں ہے۔ تم بزدل ہو میرے..."

"یہ کڑوا سچ میں نے کہا تھا۔ اس میں اتنے Guts نہیں ہیں کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ جائے"۔ نادیہ اسکے منہ سے شائی کی تعریف برداشت نہ کر سکی۔ اسکی بات کاٹتے ہوئے بلا سوچے سمجھے بول پڑی۔

شہباز خان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"کیا کہا تھا تم نے"۔ وہ جیسے مزید تصدیق چاہتا تھا۔

"یہی حرام کی اولاد۔ جسے آپ شائی کی دلیری سمجھتے ہیں۔ وہ اتنی بہادر نہیں ہے کہ ایسی بات کہہ دے"۔ وہ اپنے آپ کو بہادر ثابت کرتے ہوئے بولی۔

"گڈ گوڈ"۔ وہ اپنے آپ سے بولا۔

"مجھے سچ بولنے والے ہمیشہ اچھے لگے ہیں"۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

اور۔۔۔ نادیہ نے اسے اپنی تعریف سمجھ لیا۔

"وہ تو اس دن گھر پر ہی نہیں تھی۔ وہ تو اتنی بدھو ہے کہ پہاڑ پر آپکے قریب والے سویٹ میں رہتے ہوئے بھی بے خبر رہی کہ آپ وہی ہیں جس نے اسکو پروپوز کیا تھا"۔

"تم کیسے جانتی تھیں سب میرے بارے میں؟"

ذہن پر کا گراں بار ہلکا ہوا تو اسے تجسس ہوا۔

"آپکا ذکر ایک بار ہمارے یہاں ہوا تھا۔ آپکی انڈسٹریز کا کوئی ایڈ آیا تھا اخبار میں۔ پاپا

وہی پڑھ کر میری مام سے کہنے لگے۔

''شہباز گروپ آف انڈسٹریز کا مالک شہباز خان ہے۔ بڑے نامی گرامی خاندان کا ہے لیکن اسکے ساتھ ایک ٹریجیڈی ہے۔ He is an illegitimate child of his parents.''

''ہوں''۔ وہ ہی جانتا تھا کہ وہ اپنے متعلق یہ بات کیسے برداشت کر پا رہا تھا۔

اور وہ۔۔۔ سمجھ گیا یہ اذیت ناک قصہ، یہ جان لیوا داستان آخری دم تک اسکا پیچھا نہیں چھوڑنے والی!

''اوکے۔ اب اجازت دو''۔ وہ بڑے تحمل سے بولا۔

وہ کتنا کمپرومائزنگ بن گیا تھا اپنی تخلیق کے بارے میں۔ سمجھوتہ کرنیوالا!

وہ تھکا تھکا سا ایک بار پھر اپنے بستر پر اوندھا ڈھیر ہو گیا۔ لگتا تھا میلوں بھاگ بھاگ کر آیا تھا، کوسوں طے کر کے آیا تھا، لامتناہی فاصلے!

ساتھ ہی ایک ہلکا پن۔۔۔ جیسے بھاری وزن ہٹا دیا گیا ہو اسکے جسم کے اوپر سے۔

وہ اس دنیا میں آنیوالا ایک بن بلایا مہمان تھا۔ ایک ان چاہی خواہش تھا۔ وہ مانتا تھا پر۔۔۔

یہ طعنہ اسے شائی نے نہیں دیا تھا۔۔۔ یہ ہی بہت تھا۔

وہ جس کیلئے بے چین، بے قرار اور بے کل رہتا تھا۔ ایک ان دیکھی سی، انجانی سی، انوکھی سی خلش جس کیلئے محسوس کرتا تھا۔ اس نے اسے بے عزت نہیں کیا تھا۔ یہی غنیمت تھا!

اور۔۔۔ اچانک اسے ڈھیر ساری خوشیوں نے آلیا۔

وہ جو انجانے میں اسکی زندگی بن چلی تھی اس نے اسے نہیں ٹھکرایا تھا۔

یہ بات کسی اور نے کی تھی اور اسکی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی!

معاً اسے خیال آیا۔ شائی کے فادر نے کہا تھا شائی ابھی چھوٹی ہے اور اس نے تعلیم بھی مکمل کرنی ہے۔

کیا صرف یہی تھا یا۔

'شہباز گروپ آف انڈسٹریز کے مالک کو کون نہیں جانتا۔ نامی گرامی لوگ ہیں آپ'۔ ایسا بھی کچھ کہا تھا غالباً۔ اس نے ذہن پر زور دے کر اس جان لیوا پیغام کو یاد کیا۔

اس دوسری بات سے کیا مطلب لیا جا سکتا تھا؟

کیا صرف یہی کہ وہ نامی گرامی لوگ تھے۔ یا یہ کہ وہ اسکے بارے میں اسکی ولدیت کے بارے میں بھی جانتے تھے؟

ایک بار پھر وہ اپنی پیدائش کو کوسنے لگا۔

اسکی اس مور والی مثال تھی جو اپنی خوبصورتی کو دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگتا ہے لیکن جوں ہی اپنی ٹانگوں پر نظر جاتی ہے رو پڑتا ہے!

اور پھر وہ اپنی پیدائش کا راز ان لوگوں کو تو ضرور بتائیگا جہاں وہ شادی کا خواہشمند ہوگا۔

وہ تو چھوٹی سے چھوٹی بات سچی اور کھری پسند کرتا تھا کہاں کہ اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنا ہو!

وہ شائی سے ملے گا۔ اسے اپنے متعلق سب بتائیگا۔ اسکے فادر کو بھی تمام حقیقت سے آگاہ کریگا اور۔۔۔ از سر نو اسے پروپوز کریگا۔

اگر ان لوگوں کو وہ اس تلخ حقیقت کیساتھ قبول ہوگا تو ٹھیک ورنہ۔۔۔

اس نے سوچا۔ وہ شادی ہی نہیں کریگا۔

گھر گھر جا جا کر اپنی اصلیت بتانا۔ کبھی دھتکارا جانا اور کبھی محض بے تحاشہ دولت کی خاطر قبول کیے جانا اسے بھی منظور نہیں تھا۔

کیا وہ خود کچھ نہیں تھا؟ کیا خود اسکی کوئی شناخت نہیں تھی؟ کیا وہ بھی گوشت پوست کا بنا خدا کی مخلوق نہیں تھا؟

تم نے مجھے کیوں جنا؟ اس نے اپنی جنم دینے والی کو ایک بار پھر برا بھلا کہا۔

کہ اس نے اسے جنم دیکر اسے جیتے جی ایک مستقل جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ جہاں وہ۔

جل رہا تھا، بھسم ہو رہا تھا اور۔

تکلیف تھی کہ حد سے باہر ہو رہی تھی۔ ٹیسیں تھیں کہ برداشت سے باہر ہو رہی تھیں اور ـــ اسکی روح تک چیخ رہی تھی، کراہ رہی تھی، نالہ فریاد کر رہی تھی اور وہ ـــ

یہ سب سہنے پر مجبور تھا ـــ کہ اسے جینا تھا!

ایک گہری سانس کراہ بن کر اسکے ہونٹوں پر آئی۔ وہ بستر سے اٹھ آیا۔

یہ کیسی خوشی ملی تھی اسے؟ ادھوری ادھوری سی، تشنہ تشنہ سی!

پھر بھی ـــ وہ آس اور یاس کی ملی جلی کیفیت میں ڈریسنگ روم جا کر تیار ہونے لگا۔ نیچے جا کر نانو کیساتھ ناشتہ کیا۔ اور آفس جانے کیلیے پورچ میں نکل آیا۔

وہ پہلے فاروق کے پاس جائیگا۔ ساری بات ڈسکس کریگا۔ اس نے سوچا۔

اور پھر اپنے آفس کی بجائے وہ امید و بیم کی ملی جلی کیفیت میں فاروق کے آفس جا پہنچا۔

فاروق ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھ کر اسکا انتظار کرنے لگا۔

آج ہر چیز بہت خوبصورت لگ رہی تھی، پرکشش لگ رہی تھی!

میز پر سجے موسم کے تروتازہ پھول زندگی کا پیغام دے رہے تھے۔

فاروق آیا تو اس نے اسے ساری بات بتادی۔ کس طرح اسکی باتوں کی ہیر پھیر میں آ کر شائی سے جلتے ہوئے نادیہ نے اس سے وہ بات کہہ ڈالی جس نے اسے قریب المرگ کر دیا تھا، جینے سے بے زار کر دیا تھا اور شائی سے بدگمان کر دیا تھا ایسا کہ ـــ

اسے چاہنے کے باوجود وہ اسکا نام نہیں لے سکتا تھا!

"میں نے کہا نہیں تھا وہ بہت معصوم لگتی ہے۔ میں بھی حیران تھا کہ وہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ گئی"۔ فاروق نے کہا۔

"وہ واقعی بہت معصوم ہے۔ اتنی گندی بات وہ زبان پر نہیں لا سکتی"۔ شہباز خان کے چہرے پر عرصہ بعد رونق کی دمک تھی۔

پرکشش نقوش زندہ زندہ تھے، سیاہ چمکتی آنکھوں میں جینے کی امنگ تھی اور ـــ دلآویز

مسکان میں زندگی کی تمنا تھی!

"پھر نانو سے بات کروں"۔

"نہیں۔ پہلے میں شائی سے ملونگا۔ اسے سب بتاؤنگا"۔

"اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مجھے یقین ہے"۔ فاروق اسکی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"وہ بہت چھوٹی ہے اسے دنیا کی اونچ نیچ کی کوئی خبر نہیں۔ میں صرف اس پر اکتفا نہیں کرونگا۔ اسکے فادر سے بھی ملونگا۔ تمام حقیقت بتاؤنگا۔ اگر انہیں مناسب لگا تو تب ہی شائی کا ہاتھ ان سے مانگونگا"۔

اور فاروق کو اپنا دوست بہت اونچا بہت عظیم لگا!

"شہباز تمہاری نیت جتنی صاف ہے اسکا ایوارڈ تمہیں ضرور ملے گا"۔

"تم میری کامیابی کیلیے دعا کرنا"۔

"ضرور"۔

"اچھا۔ چلتا ہوں" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

فاروق نے اسے رکنے کو نہیں کہا کہ اسے معلوم تھا اس وقت اسکا بے تحاشہ کام ہوتا تھا۔

"گڈ لک"۔ فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور شہباز خان پروقار انداز میں چلتا باہر کی طرف بڑھا۔

باوجود بے اندازہ مصروفیات کے شہباز خان نے وقت نکالا۔ دو دن برابر چالیس پینتالیس میل کا فاصلہ طے کیا۔ ایک اٹھارہ سالہ امیچور لڑکے کی طرح شائی کے گھر کے چکر کاٹے۔

وہ، دو گرلز کالجوں کے گرد گھوما ــــ بار بار چکر لگائے، بار بار گھوما پھر اگر۔

شائی اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ مایوس ہو کر وہ پلٹا۔

آج پھر سوچ رہا تھا جانے کا ــــ مگر عین کالج کی چھٹی کے وقت پر پہنچنا کچھ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج دس بجے میٹنگ تھی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اور اس نے اسے پرزائیڈ کرنا تھا۔ مشکل تھا ایک بجے سے پہلے فارغ ہونا۔

اور پھر آج ــــ فاروق کے بھائی کی منگنی بھی تھی۔ وہ کبھی ایسے فنکشنز پر نہیں گیا تھا مگر ــــ فاروق کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا تھا۔

شام پونے سات بجے وہ تیار تھا۔ لائیٹ گرے سوٹ میں وہ بہت باوقار لگ رہا تھا۔ آج پھر وہ بغیر کسی اسکارٹ کے رواں دواں تھا۔ نانو سے گن مین ساتھ نہ رکھنے پر قدرے لے دے بھی ہوئی تھی۔ جانے کیوں نانو سوچتی تھیں وہ اکیلا نکلا نہیں اور کسی نے اسے نقصان پہنچایا نہیں۔

بات انکی بھی ٹھیک تھی۔ احتیاطاً اس نے گاڑی بدل لی۔ روٹین کی گاڑیوں سے ہٹ کر گاڑی لی اور فاروق کی طرف چل دیا۔

ٹھیک سات بجے وہ انکے گیٹ میں داخل ہوا۔

بڑی رونق تھی، چہل پہل تھی، کوٹھی درخت پودے قمقموں سے جگمگا رہے تھے۔ نوکر چاکر ادھر سے ادھر چاق و چوبند گھوم پھر رہے تھے۔ گھر کے مکین یا پھر قریبی رشتہ دار عمدہ لباسوں

میں ملبوس پورچ میں مہمانوں کو ریسیو کرنے کیلئے پہلے سے موجود تھے۔

فاروق بھی وہیں تھا۔ اسکے پاس آیا اور گاڑی ایک طرف پارک کرنے کو خود بھی ساتھ ساتھ چلا آیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آؤ تمہیں بٹھاؤں۔ پھر اندر چلتا ہوں بڑے کام ہیں"۔

وہ اسے وسیع لان میں لے آیا۔ یہاں قناطیں لگی تھیں۔ مہمانوں کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ اس نے شہباز خان کو ایک قریبی رشتہ دار کے پاس بٹھایا۔

"مائینڈ مت کرنا۔ میں جاتا ہوں، امی مجھے کوس رہی ہونگی"۔

"مجھے بھی کچھ ہیلپ کرنے دو"۔ شہباز خان نے پیشکش کی۔

وہ ہنس دیا۔

"کبھی کام کیا ہو تم نے تو کام لوں"۔

شہباز خان بھی ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

"نہیں خیر ایسا بھی نہیں ہے"۔

"بالکل ایسا ہے۔ بیٹھو تم"۔ وہ جلدی میں تھا۔ گھر کے اندر چل دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مہمان باقاعدہ آنا شروع ہو گئے۔ ہر گاڑی پورچ جا کر خواتین کو اتار کر آگے بڑھتے ہوئے پارکنگ میں کھڑی ہونے لگی۔ بلکہ اب تو اندر گاڑیوں کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔ کوٹھی سے باہر قطاریں لگنا شروع ہو گئی تھیں۔

رونق بڑھنے لگی تھی، رنگین آنچل لہرانے لگے تھے، نقرئی قہقہے گونجنے لگے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ بھی سنائی دینے لگی تھی۔

زندگی میں پہلا تجربہ تھا یہ سب دیکھنے سننے کا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے سب دیکھ رہا تھا۔

دکھ تو اپنی جگہ ہیں لیکن... اپنی خوشیوں کو رنگین بنانا کوئی بری بات تو نہیں، اس نے سوچا۔

معاً شہباز خان چونکا۔ ایک لمبی سفید گاڑی پورچ میں آ کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے اترتے ہوئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا تھا اور اس میں سے۔

شائی برآمد ہوئی تھی۔

وہ شائی ہی تھی۔ سفید ریشم کے ڈھیلے ڈھالے نرم ونازک کپڑوں میں کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔

اسکی خوشی، اسکا اشتیاق ایک بار پھر اسے اٹھارہ سال کا امچیور لڑکا بنا رہے تھے۔ کس قدر ایکسائٹمنٹ ہوئی تھی اسے!

کتنا خوبصورت اتفاق تھا! کتنا حسین!

وہ اکیلی تھی۔ اسکی شیپر ون اسکے ہمراہ نہیں تھی۔

وہ اندر جا چکی تھی، گہما گہمی خاصی بڑھ گئی تھی، مگر۔

اب اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ کچھ بے قرار سا تھا، بے کل سا!

''اندر چلو۔ ڈانس ہو رہے ہیں بڑا مزہ آ رہا ہے''۔ فاروق نے اسکے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا خالی گلاس لیا تو وہ چونکا۔

''میں۔ میں کیسے جاؤں؟'' وہ واقعی گھبرا گیا تھا۔

اتنی رش میں وہ بھی خواتین میں؟ یہ اسکے بس کا کام بالکل نہیں تھا۔ فاروق جانتا تھا!

''آؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں نا''۔

''فاروق پلیز! میں واقعی نہیں جا سکونگا''۔

''کیا چیز ہو''۔

لیکن فاروق اسکی عادت جانتا تھا اسے معلوم تھا وہ نہیں آ سکے گا۔

''مائینڈ مت کرنا پلیز! میں گر جاؤنگا اتنی لیڈیز میں...''۔

فاروق زور سے ہنس دیا۔

''اور جو اپنی شادی ہو گی تو''۔

''کیا تب بھی ایسا ہی ہو گا؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ چرچ میں ہو گی۔ پریسٹ کے سامنے ساچھا میں چھتا ہوں۔ روانگی بس ہونیوالی

ہے''۔

''روانگی؟ کیسی روانگی؟'' اسکا تو خیال تھا فاروق کے یہاں فنکشن تھا اور بس!

''واہ میرے یار۔۔۔ ہارون بھائی انگوٹھی کس کو پہنائینگے؟ کیا لڑکی خود چل کر یہاں آئیگی انگوٹھی پہننے؟''

''تو ہارون بھائی اب لڑکی کے پاس جائینگے؟''

فاروق کا پھر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''صرف وہ نہیں جائینگے۔ یہ جو سب لوگ یہاں موجود ہیں یہ سارے جائینگے۔ اکیلے میں تھوڑی انگوٹھی پہنائینگے۔ ان سب کے سامنے پہنائینگے۔ یہ سب گواہ ہونگے تاکہ کل کو مکر نہ سکیں ہارون بھائی...''۔ وہ ہنس ہنس کر بتا رہا تھا اور۔۔۔

شہباز خان کچھ کھو سا گیا تھا۔

''سمجھے؟''

''آں۔۔۔ ہاں۔ مگر تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب۔ بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد تم سے اجازت لونگا۔ کافی دیر سے آیا ہوں...''۔

''چپ۔ خبردار جو وقت کی بات کی۔ وقت، وقت، وقت۔ Big Ben میں بند کر کے رکھ دونگا''۔

اور شہباز خان خوبصورتی سے ہنسنے لگا۔

فاروق واپس اندر چلا گیا۔

اور وہ۔۔۔ گھڑی دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں کب یہ لوگ یہاں سے روانہ ہوں اور پھر پتہ نہیں وہاں کتنا وقت لگے؟ وہ حقیقت میں پریشان لگنے لگا۔ نانو سے بھی یہی کہا تھا کہ فاروق کے یہاں منگنی کا فنکشن ہے اور بس!

تھوڑی ہی دیر بعد فاروق عجلت میں اسکے قریب آیا۔

''اپنی گاڑی کی چابی دو''۔

اس نے جلدی سے جیب سے چابی نکال کر اسے تھما دی۔

لوگ گاڑیوں میں بیٹھنے لگے تو وہ بھی چونکا۔۔۔ اٹھ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہیں اسے فاروق ملا۔

"یہ مہمان ہیں، تم اپنی گاڑی میں لے جاؤ"۔ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی مہمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اسے چابی تھما دی۔

"Sure." اس نے کہا۔

اور تو کوئی ہیلپ نہیں کر سکا تھا، یہ تو کر سکتا تھا!

"اور نکلو۔ یہ جو گاڑیاں جا رہی ہیں انہیں Follow کرو۔ میں بس تمہارے پیچھے پیچھے ہوں"۔

"او کے"۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"گڈ لک"۔ فاروق نے کھلے شیشے میں مزید کہا۔ اور باقی گاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

فاروق بڑی عجلت میں تھا۔ شاید جانے کو دیر ہو رہی تھی۔ وہ بھی گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے ایک آگے بڑھتی گاڑی کے پیچھے ہو لیا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ذہن میں یہ دستور اور رواج سمائے ہوئے تھے۔

'... یہ جو سب لوگ یہاں موجود ہیں یہ سارے جائینگے۔ اکیلے میں تھوڑی انگوٹھی پہنائینگے۔ ان سب کے سامنے پہنائینگے۔ یہ سب گواہ ہونگے تا کہ کل کو مکر نہ سکیں ہارون بھائی...'۔

کاش! دل کے نہاں خانوں سے اک ہوک سی اٹھی۔

اسے جنم دینے والی نے بھی ڈھیر سارے گواہوں کے سامنے بھرے مجمعے میں اسکے باپ کیلئے اقرار کیا ہوتا!

ہمارے معاشرے میں دستور، گواہ اور ثبوت چاہیئے ہوتے ہیں۔

اس نے پیار ہی کیا تھا نا!

مقابلہ کر لیتی زمانے کا۔ لڑ جاتی سماج سے۔ ڈٹ جاتی دنیا کے آگے۔۔۔ اپنے پیار کیلئے،

اپنی محبت کیلئے۔ اسکے باپ کیلئے!

آج پہلی بار اس نے اپنی جنم دینے والی کو اپنی سوچوں میں وقت دیا تھا۔

تب وہ کتنے فخر سے دوستوں میں کہتا۔ تمہیں پتہ ہے میرے Parents کی لو میرج ہوئی تھی۔ میں اپنے ماں باپ کی محبت کی نشانی ہوں۔ مگر آج۔

آج وہ ان دونوں کے گناہ کی پیداوار تھا۔ خود ایک گناہ تھا۔ مجسم گناہ!

"آپ۔ آپ..."۔

اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ اور اسکی محویت ٹوٹی۔ گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

شائی تھی۔ سٹریٹ لائیٹس کی روشنیوں میں صاف نظر آ رہی تھی۔ مگر۔۔۔

ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ چلتی گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی جیسے!

شائی نے اپنی گاڑی واپس کر دی تھی۔ فنکشن رات گئے ختم ہونا تھا۔ اور فاروق کی چھوٹی بہن نادرہ نے اسے اپنے یہاں ہی رات گزارنے کو کہا تھا۔

نادرہ یہاں ایف اے کرنے کے بعد شائی کے کالج میں تھرڈ ائیر میں ہوسٹل میں داخل ہوئی تھی۔ دونوں کلاس فیلوز بھی تھیں اور اچھی دوست بھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ ہارون کی منگنی پر نادرہ کی دوستوں میں سرفہرست پر تھی۔

مہمان گاڑیوں میں بھر بھر کر جانے لگے تو فاروق اسے اس گاڑی میں لے آیا۔

"آپ اس گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ اس میں لوگ بھی زیادہ نہیں ہیں۔ آپکو آرام رہے گا"۔ اس نے کہا تھا۔ لیکن۔

اسے کیا معلوم تھا کہ یہ شہباز خان کی گاڑی تھی۔

ابھی ابھی سٹریٹ لائیٹس کی روشنی میں اس نے شہباز خان کا چہرہ دیکھا تھا۔

جلدی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلتی گاڑی میں دروازہ نہیں کھولتے"۔ اسکے لہجے میں ملائمت تھی، اپنائیت تھی۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ"۔ اسکی مشتعل آواز گونجی۔

''باپ رے''۔ اس نے اسکا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''مجھے یہیں اتار دیں''۔

اس نے آہستہ سے گاڑی باقی گاڑیوں کی قطار سے باہر نکال لی۔ دھیرے دھیرے کچے پر آگے بڑھنے لگا۔

باقی گاڑیاں سَن سَن کرتیں پاس سے نکلنے لگیں۔

''روکیں گاڑی''۔

''نہیں''۔

''کہا نا روک لیں''۔

''کہا نا نہیں روکونگا''۔

''میں شور مچادونگی''۔

''مچادو''۔ اسے ہنسی آگئی۔

گاڑیاں اب تقریباً ساری نکل گئی تھیں۔ وہ دوبارہ پکی سڑک پر ہولیا۔

سٹریٹ لائیٹس کی حدود سے اب وہ باہر نکل آئے تھے۔ اندھیرا خاصا تھا۔ سڑک سنسان ہوتی جارہی تھی۔

شائی نے ایک بار پھر ہاتھ دروازے کی طرف بڑھایا۔

''کیا کر رہی ہو''۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھا کر اسے روکا۔

''میں آپکے ساتھ نہیں جاؤنگی''۔

''اب تو آگئی ہو''۔

''اتار دیں مجھے''۔

''اوں ہوں''۔ اس نے سر خوبصورتی سے نفی میں ہلادیا۔

''میں نے کہا نا اتار دیں''۔

''میں نے بھی کہا نا نہیں اتارونگا''۔ اسکے لہجے میں خوشی کی چہکار تھی۔

''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا''۔ وہ سنگین لہجے میں بولی۔

''اوہ''۔ وہ چپ سا ہوگیا۔

اسے تو یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ مگر وہ ــــ اس نے تو بات ہی ختم کردی تھی۔ بہرحال۔

''رات ہے اور تم اکیلی ہو۔ بری بات ہے''۔ اسکی ساری ایکسائیٹمنٹ جاتی رہی تھی۔

گاڑی آہستہ کرتے ہوئے وہ ناصحانہ انداز میں بولا کہ یہ اسکا فرض بھی تھا۔

''بری ہے یا اچھی میں آپ کیساتھ نہیں جاؤنگی''۔ اس نے 'آپ' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سٹیرنگ وہیل پر اسکی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ رفتار مدھم ہوگئی اور پھر ــــ اس نے گاڑی ایک جانب روک لی۔

وہ آبادی سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ سڑک سنسان تھی اور ــــ اندھیرا ــــ گہرا تھا!

ڈرائیونگ سیٹ سے وہ پچھلی طرف آگیا۔ اسکا دروازہ کھولا۔

''آؤ''۔ سنجیدگی کیساتھ اسکے لہجے میں اسکی بے جا ضد پر غصہ کا عنصر بھی شامل تھا۔

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اتار دے اسے، پر اب خیال آیا کہ سڑک تو بالکل ویران تھی اور نادرہ کا گھر بھی خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ رات کے اس گھپ اندھیرے میں اکیلی کیسے کہیں جائے گی؟

پھر بھی۔ وہ جھجکتے جھجکتے باہر نکل آئی۔

اور ــــ وہ اسکی پریشانی بھانپ گیا۔ اس پر آیا غصہ مفقود ہونے لگا۔ چند پل اسے یوں ہی تکتا رہا۔

''اچھا۔ تم... کرو جو کرنا ہے''۔ اس نے پرکشش انداز میں کندھے اچکائے۔ ''میں چلتا ہوں''۔

واہ ــــ وہ مرنہ جاتی اکیلی رات کے اس سناٹے میں!

وہ چپ رہی بولی کچھ نہیں۔ کہ اب اسے روکنا خودداری کے آڑے آتا تھا۔

''مجھے اجازت؟'' وہ اسکے جھکے سر کو تکتا رہا۔ ''چلوں میں؟'' اسے ہنسی بھی آرہی تھی۔

وہ اب بھی چپ رہی۔اسے اتار دینے کا شور تو اس نے خود مچایا تھا۔ویسے ایک بات ضرور تھی۔اسکی موجودگی میں وہ محفوظ ضرور محسوس کر رہی تھی۔پھر۔

اس کیساتھ نہ جانے کی رٹ کیوں لگائی تھی؟

کیوں نہ لگاتی رٹ۔۔۔ کہ وہ اسکا لگتا بھی کیا تھا۔وہ تو اسے روتا بلکتا دیکھتا تھا پر پسیجتا نہ تھا،کڑھتا تڑپتا دیکھتا تھا پر ترس نہ آتا تھا بلکہ۔۔۔ جیسے نہ وہ اسے جانتا تھا،نہ کبھی دیکھا تھا نا ہی وہ اسکی پڑوسن تھی!

''او کے۔گڈ لک''۔

اسے وہیں چھوڑتے ہوئے وہ سامنے سے گھوم کر اپنی سیٹ پر آیا۔بیٹھا۔اور گاڑی روانہ کردی۔

شائی کی جان نکل گئی۔بے اختیار چیخنے کو جی چاہا۔پتہ نہیں کیا ہونیوالا تھا؟کوئی اسے اٹھا کر چل دیتا تو؟

مارے خوف کے اسکی آواز حلق میں اٹک گئی۔پھیلی پھیلی آنکھیں اب بھی شہباز خان کی گاڑی پر جمی تھیں۔

شہباز خان آہستہ آہستہ جا رہا تھا،نظریں ویو مرر پر تھیں۔پھر جلد ہی اسے اس پر ترس آ گیا۔لمحوں میں ہی وہ اسے اس کیساتھ نہ جانے کی کافی سزا دے چکا تھا۔اسے معلوم تھا وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔اور پھر وہ۔۔۔ اسے یوں اکیلا اندھیری رات میں سنسان سڑک پر تھوڑی چھوڑ کر جا سکتا تھا۔وہ تو برابر اس پر نظریں جمائے تھا۔ایک پل کو بھی نظریں ہٹائی نہیں تھیں اس پر سے۔

وہ چاہتا تو اسے زبردستی بھی گاڑی میں بٹھا سکتا تھا مگر۔۔۔ اسکے بار بار ساتھ نہ جانے کی رٹ پر اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔ذرا ڈرانا چاہتا تھا اسے اور بس!

گاڑی واپس موڑتے ہوئے وہ اسی پر نظریں جمائے دھیرے دھیرے اسکی طرف بڑھنے لگا۔

نزدیک پہنچ کر اس نے دوبارہ گاڑی کا رخ موڑا اور اسکے قریب لا کر رک گیا۔انجن اب بھی سٹارٹ تھا۔ہاتھ بڑھا کر اس نے پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھولا اور سامنے دیکھتے ہوئے اسکے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا مگر۔۔۔

اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔لمحوں میں ہی وہ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

''چلیں''۔بے طرح آئی ہنسی روکتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔چپ چاپ سامنے تکتی رہی۔

گاڑی آگے بڑھنے لگی۔

''کوئی اٹھا کر لے جاتا تو؟''ایک نظر اسکے خوبصورت چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ آہستہ سے بولا۔اسکی آواز میں دھیما پن تھا،لہجے میں بلا کی ملائمت۔

اس سے قبل شہباز خان نے کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔نا ہی شائی نے کبھی ایک لفظ کہا تھا۔اسکے باوجود اسے لگتا تھا وہ مدتوں سے اسے جانتا تھا۔۔۔ بہت قریب سے،، بہت پاس سے۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔سامنے ہی دیکھتی رہی۔

''اور تم''۔اسے جیسے اچانک خیال آیا۔''یوں فاروق کے کہنے پر کیوں کسی اجنبی کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں؟یہ میں نہ ہوتا کوئی اور ہوتا تو؟''اب کے اسکے لب و لہجے میں تشویش اتر آئی تھی۔

وہ بھی جیسے سہم سی گئی۔واقعی یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

یہ تو نادرہ فاروق کے کہنے پر اسے بلانے آئی۔جلدی جلدی فاروق کا تعارف کروایا۔وہ فاروق کو پہلے سے جانتی تھی اسے خوشی بھی ہوئی۔اور جب اس نے اسے اس گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

اسکی بات صحیح تھی اسے یوں بغیر سوچے سمجھے کسی اجنبی کی گاڑی میں نہیں بیٹھنا چاہیئے تھا بہر حال۔

وہ کچھ بولی نہیں کہ وہ ـــــ اس سے ناراض تھی۔ بہت زیادہ۔ اس نے اسکا دل توڑا تھا اسلئے!

وہ چند لمحے خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

''آئندہ ایسا کبھی مت کرنا سمجھیں''۔ اس نے پھر ایک نظر اس پر ڈالی۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔

''تم ـــ بول نہیں رہیں''۔ اسکی آنکھیں رات کے اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں اور وہ ملگجے سے اندھیرے میں اسے صاف نظر آ رہی تھی۔

وہ ہنوز چپ رہی۔ نظریں ایک ٹک سڑک پر جمی رہیں۔

وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

''تم ـــ ہل سٹیشن سے اچانک کیوں چلی آئیں؟''

وہاں ایک چپ تھی۔

''میں نے تمہیں بہت مس کیا تھا''۔

اور بے اختیار شائی نے رخ اسکی طرف کر لیا۔ اسکی خشمگین نظروں میں ناراضگی تھی، غصہ تھا، خفگی تھی ـــ وہ اسی کے ہاتھوں اپنا ریزہ ریزہ ہوتا دل بھولی نہیں تھی۔ یہ تو اسے بھی معلوم تھا وہ اسے پسند کرتا تھا لیکن ـــ پھر یہ۔

اتنی ساری بے حسی کیوں تھی؟ سنگینی کیوں تھی؟

وہ بے اندازہ خفا تھی اس سے۔ اسلئے اب تک اس سے بات نہیں کر رہی تھی۔

مانا کہ اس نے اس کیساتھ بہت زیادتی کی تھی مگر ـــ بعد میں وہ بھی تو بہت بے قرار ہوا تھا، بے چین ہوا تھا، بے کل ہوا تھا۔

وہ مسکرا دیا۔ ہولے سے۔

''یہ ـــ گارڈن روڈ سٹریٹ ایٹ ہے کہاں؟'' اچانک اسے خیال آیا انہوں نے جانا کہاں تھا؟

وہ تو ان راستوں سے قطعاً ناواقف تھا۔

فاروق سے بھی پوچھ نہ پایا تھا کہ وہ بھی شائی کو اس تک پہنچانے میں خاصا بدحواس ہو گیا تھا۔ گاڑیوں کا پیچھا کرنے کا کہہ کر عجلت میں نکل گیا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ فاروق اسے اس لمحے بہت مہربان لگا۔

''ہوں ـــ تم نے بتایا نہیں''۔ اس نے پھر کہا۔

شائی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اسکی بات کا جواب اس نے ویسے بھی نہیں دینا تھا۔

''اوہ۔ تو تم بات نہیں کرو گی''۔

شائی نے اسکی طرف دیکھا۔ بھولا بھولا سا منہ لئے، روٹھی روٹھی سی شکل لئے۔ اور ـــ سر نفی میں ہلا دیا۔ منہ سے اب بھی کچھ نہیں بولی۔

جانے کہاں سے اسے اپنا خواب یاد آ گیا۔ ایسی ہی تو شکل لئے تھی وہ۔

اسے وہ بہت اچھی لگی۔ چھوٹی سی، دو تین سال کی، پیاری سی۔

''میں پچھلے دنوں دو دن برابر تمہارے شہر گیا ہوں۔ تمہارے گھر کے چکر لگائے۔ ایک کی جگہ دو دو گرلز کالجز کے آگے مارا مارا پھرا مگر۔ تم دکھائی نہیں دیں...''۔

اسے تڑپا تڑپا کر، رلا رلا کر کیا اب اسے پچھتاوے کا احساس ہوا تھا۔

وہ خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی۔

شہباز خان نے گہری سانس لی۔

''بات کرو نا''۔

اس نے پھر اسے دیکھا انہی ناراض ناراض خفا خفا نظروں سے۔

ایک بار پھر سر نفی میں ہلایا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''آؤ صلح کر لیتے ہیں''۔ اس نے اپنا بڑا سا مضبوط ہاتھ اسکی طرف بڑھایا۔

اور شائی نے جھٹ اپنے دونوں خوبصورت نازک ہاتھ اپنے پیچھے کر لئے۔

اسکی ہر ادا کتنی Adorable تھی!

وہ ہنس دیا۔ بے بس سا!

چند ثانیے یوں ہی مدھر مسکان ہونٹوں پر لئے سامنے تکتا وہ ڈرائیو کرتا رہا۔

پھر بایاں ہاتھ بڑھایا، آہستہ سے اسکا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

''تم ـــ زبان پچھلی سیٹ پر تو نہیں چھوڑ آئیں''۔

اور شائی نے اسکے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

وہ لڑھک کر سٹیئرنگ پر جا گرا۔

ایکٹر کہیں کا! شائی نے رخ واپس پھیر لیا۔

پل میں ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔ نظریں سڑک پر جما دیں۔ رفتار تیز کر لی۔

''پلیز بتاؤ۔ گارڈن روڈ کہاں ہے؟ فاروق میری جان کو رو رہا ہو گا''۔

انہیں واقعی بہت دیر ہو گئی تھی۔ نادرہ بھی نوٹ کرنے لگی ہو گی۔ معاملہ سیریس ہوتا جا رہا تھا۔ شائی نے ڈیش بورڈ پر رکھا پین اٹھایا اور ہتھیلی پر گارڈن روڈ کا نقشہ بناتے ہوئے ہاتھ چپ چاپ اسکے سامنے کر دیا۔

کیا ادا تھی ـــ وہ دلآویزی سے ہنس دیا۔

اسکا ہاتھ پکڑا۔ لائیٹ آن کی اور دیکھنے لگا۔

''ہوں...''۔ وہ چونکہ بالکل ہی ناواقف تھا ان راستوں سے، سو سمجھنے کی ناکام سی کوشش کی۔

پھر لائیٹ آف کی اور آگے بڑھنے لگا۔

شائی نے محسوس کیا وہ جان بوجھ کر اب بھی اسکا ہاتھ پکڑے تھا۔ ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

اس نے جھٹ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''تمہاری ـــ کسی بلی وغیرہ سے تو رشتہ داری نہیں''۔

وہ چپ رہی۔ سیریس بنی رہی۔

وہ آگے بڑھا۔ چند دکانیں نظر آئیں، گاڑی وہیں ایک طرف روک لی۔

''بھاگ مت جانا۔ میں گارڈن روڈ کا پتہ کر کے آتا ہوں''۔

اور پھر بڑے بڑے قدم اٹھاتا چل دیا۔

وہ اسے جاتے دیکھنے لگی۔ کتنی کتنی بے قرار ہوئی تھی وہ اس کیلئے، کتنا کتنا تڑپی تھی۔ بالکل کسی گھائل پنچھی کی طرح، کسی ماہیٔ بے آب کی طرح!

بہت کوشش کی تھی اسے بھلانے کی، اپنے آپکو بہلانے کی، مصروف رکھنے کی۔ مگر۔ کوئی کوشش کارگر نہ ہو سکی۔ نہ وہ اسے بھلا سکی، نہ اپنے آپکو بہلا سکی، نہ مصروف رکھ سکی کہ ـــ

اسکی یاد اسے مصروف ہونے ہی نہیں دے رہی تھی۔ ہر پل چھایا رہتا تھا دل و دماغ پر، حواسوں پر۔

بارہا وہ راتوں کو چپکے سے رو دیتی!

آج اسے اچانک دیکھ کر اسکا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

یہ الگ بات تھی کہ وہ اس سے خفا تھی اور اس پر بہت غصہ بھی۔

وہ واپس آ رہا تھا۔ لائیٹ گرے سوٹ میں ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہا تھا۔

''تم یہیں ہونا''۔ سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے اس نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

شائی نے آہستہ سے اسکا ہاتھ ہٹا دیا۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

گاڑی آگے نکال لی۔

''بس دس پندرہ منٹ کا راستہ اور ہے''۔ اس نے کہا۔

وہ اب بھی سامنے سڑک پر نظریں جمائے تھی۔

''تم ـــ آج واپس گھر جاؤ گی؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اسے تکنے لگی۔

''او کے۔ میں کل رات تمہیں فون کرونگا۔ فون پر تو بات کرو گی نا''۔

اسے دیکھتے دیکھتے اس نے سرنفی میں ہلا دیا۔

اب بھی اسکی جھیل سی آنکھوں میں خفگی تھی، حسین چہرہ روٹھا روٹھا تھا، اور منہ پھولا پھولا!

شہباز خان نے گہری سانس لی۔

''یہ چپ کب ٹوٹے گی ہاں''۔

وہ سامنے دیکھنے لگی، خاموشی سے۔

''اے لڑکی۔ مجھے تم سے پیار ہوگیا ہے تمہیں کچھ معلوم بھی ہے''۔

شائی رخ پھیر کر اسکی طرف دیکھنے لگی۔ اب پیار ہوا تھا؟ پہلے کیا مذاق تھا؟

''بہت پہلے سے۔ تمہیں دیکھتے ہی۔ پیار ہوگیا تھا''۔ وہ فوراً سمجھ گیا۔ جلدی ہی تصیح کر دی۔

اور۔۔۔ شائی جلدی سے سامنے دیکھنے لگی۔ کہ وہ اس سے خفا تھی اور اسکے لب و لہجے پر آئی ہنسی اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

لڑکی والوں کا گھر آگیا تھا۔ فنکشن عروج پر تھا۔ وہ لوگ واقعی لیٹ ہو گئے تھے۔

پورچ میں گاڑی روکتے ہوئے وہ گاڑی کے سامنے سے گھوم کر اسکے دروازے پر آیا۔ دروازہ کھولا۔

''گڈ نائیٹ''۔ وہ اتری تو اس نے دھیرے سے کہا۔

گو اسے معلوم تھا وہ اب بھی جواب نہیں دے گی کیونکہ وہ۔۔۔ اس سے خفا تھی۔۔۔ بے اندازہ!

نظریں اٹھاتے ہوئے شائی نے اسے دیکھا اور بس۔ پھر۔۔۔ آگے بڑھ گئی۔

''میں نے تو اسے پچھلی سیٹ پر بٹھایا تھا آگے کیسے آگئی''۔ فاروق تھا، معنی خیز انداز میں گویا ہوا۔

اور۔۔۔ شہباز خان دھیرے سے مسکرا دیا۔ خوبصورتی سے، دلآویزی سے۔

راتیں خنک ہو چلی تھیں۔ اسکا ہلکا پھلکا کمبل ہٹا کر نرم و گداز موٹا کمبل رکھ دیا گیا تھا۔ سینٹرلی ائیر کینڈیشنڈ کمرے کا مدھر مہکتا ماحول یخ بستہ ہو رہا تھا۔

اس نے کروٹ بالکنی کی طرف لے لی۔ سامنے قریبی پہاڑی پر بنی فارسٹ والوں کے چوکیدار کی جھونپڑی نما کوٹھڑی میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

وہ محویت سے اسے دیکھنے لگا۔ رات سونے سے قبل اکثر یہ پراسرار سی روشنی والی کوٹھڑی اس کی نظروں کا مرکز بنتی۔

کل رات سے وہ مدہوش تھا، سرشار تھا۔۔۔ شائی کے قرب کا سحر اسے جکڑے تھا، مکمل طور پر!

کبھی وہ اسے پر ن سی سڑک کے کنارے خوفزدہ کھڑی نظر آتی، کبھی اس سے خفا روٹھی روٹھی شکل پھولا پ چہرہ لئے اور کبھی۔۔۔

اس پر ناراض، غصہ ر خشمگیں نظروں سے اسے گھورتی ہوئی!

اسے غصہ میں چھینتی جھپٹتی خوبصورت پشمینی بلی یاد آگئی۔

پہلے اس نے اسکی جھکی جھکی پلکوں اور بے اندازہ حسین آنکھوں میں اپنے لئے پیار دیکھا تھا۔

آج وہیں۔۔۔ انہی سیاہ جھالریں پلکوں تلے، بے انتہا خوبصورت آنکھوں میں خفگی، ناراضگی اور غصہ دیکھا تھا۔

وہ مان گیا وہ اسکے دام کا اسیر بن گیا تھا۔۔۔ چپکے سے، ہولے سے۔۔۔ بالکل غیر محسوس طریق پر۔۔۔ اسطرح۔

کہ خود اسے بھی پتہ نہیں چل سکا تھا!

اسکا ہاتھ خود بخود سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پر گیا۔ نمبر ڈائیل کئے۔

باپ رے۔۔۔ کسی بھاری بھر کم خاتون کی آواز تھی، یقیناً اسکی شیپر ون کی۔

اس نے جلدی سے بند کر دیا۔ بالکل ایک غیر ذمہ دار ٹین ایجر کی طرح۔ ایک۔۔۔ غیر ذمہ دار حرکت جو کر رہا تھا!

کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر سے ملایا۔

قسمت یاور ہوئی۔ شائی نے ہی اٹھالیا۔

''جی۔ کون بول رہے ہیں''۔

وہی نازک، مہین، پیاری آواز تھی۔ وہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

''شہباز''۔ وہ دھیرے سے بولا۔

ایک پل کو جیسے شائی نے کچھ سوچا تھا اور۔۔۔ ٹھک سے آگے سے بند کر دیا۔

''کیا چیز ہے''۔ وہ جھنجلایا سا بڑبڑایا۔

اور دوبارہ نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

''جی۔ کون صاحب ہیں؟'' اب کے آواز اسکی شیپر ون کی تھی۔

وہ پھر جھنجلایا۔ یقیناً وہ پاس ہی کہیں تھی۔ جان بوجھ کر شیپر ون سے اٹھوایا تھا۔ بہر حال۔۔۔

''میں شہباز بول رہا ہوں۔ شائی سے بات کرنا چاہونگا'' وہ متانت سے بولا۔ کہ وہ بار بار ٹین ایجر لڑکوں کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

''جی۔ اچھا۔ میں بتاتی ہوں''۔ انکی آواز میں تحیر کیساتھ ساتھ کچھ مرعوبیت سی بھی تھی۔

اسکا اندازہ صحیح تھا۔ شائی پاس ہی تھی۔

''تمہارا فون ہے بیٹا۔ شہباز خان ہیں۔ بات کرنا چاہتے ہیں تم سے''۔ انکی آواز صاف آرہی تھی۔

''میں بات نہیں کرونگی''۔ اسکا لہجہ اب بھی روٹھا روٹھا تھا۔

''بری بات ہے''۔

اور پھر شاید اسے موقعہ کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔

فون پر آ گئی تھی۔

''ہیلو''۔ شہباز خان دوبارہ بولا۔

''ہیلو''۔ وہ روٹھے روٹھے لہجے میں بولی۔

اور اسے ہنسی آ گئی۔

''How are you?''

''Fine, thank you.''

''کیا کر رہی تھیں''۔

''مووی دیکھ رہی تھی''۔ اسکا لہجہ اب بھی خفا خفا تھا۔

''اب تو خفا نہیں ہونا''۔

''میں بات پھپھو کی وجہ سے کر رہی تھی۔ وہ چلی گئی ہیں اور میں بند کر رہی ہوں۔۔۔''۔

''پلیز''!

''نہیں''۔ اور اس نے فون بند کر دیا۔

کیا چیز تھی؟ اور یہ جو تھوڑی سی عنایت کر دی تھی ایک دو جملوں کی یہ بھی پھپھو کی موجودگی کی وجہ سے کی تھی۔

وہ جھنجلا اٹھا۔ کیسے مانے گی یہ؟

ریسیور واپس رکھتے ہوئے وہ بستر سے اٹھ آیا۔

پھر۔۔۔ ایک بے حد دلآویز مسکراہٹ اسکے پرکشش لبوں پر پھیل گئی۔

اسکی 'نا' میں صاف اقرار تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

پلوں کی پائلیں بجتی رہیں۔دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلنے لگے۔

سردی زوروں پر تھی۔گلابی جاڑے گھر آئے تھے،دور پار کے پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھک گئی تھیں اور ـــــ شرمیلی سیندوری شامیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

وہ آج ہی جرمنی سے لوٹا تھا۔تین ہفتے کے بزنس کونفرنس پر گیا تھا۔

رات نانو کے کمرے میں ہی ان کیساتھ ڈنر کھایا تھا۔سردیوں میں ان کے گھٹنوں کا درد بڑھ جاتا تھا۔اور ڈائننگ روم کی بجائے وہ اپنے بیڈروم میں ہی کھانا پسند کرتی تھیں۔

انگیٹھی میں جلتی بڑی بڑی لکڑیوں کی تاپ میں دونوں کھانا کھاتے دیر تک باتیں کررہے تھے۔

ایک بار پھر نانو نے اسکی شادی اور سونے گھر کی آبادی کا ذکر چھیڑا تھا۔

''نانو اب جلد ہی آپکی خواہش پوری ہوگی''۔کسی خوش آئیند تصور کے تحت دل نشیں آنکھوں میں چمک لئے وہ بولا۔

نانو بھی خوش ہوگئیں۔

''ہاں بیٹا اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔یہ بڑھاپے کی شادیاں مجھے اچھی نہیں لگتیں''۔

''نہیں نانو اب دیر نہیں ہوگی۔بس آپ مجھے تھوڑی سی مہلت دیں''۔

''اور مہلت؟''

''زیادہ نہیں بس مہینہ دو کی''۔

''اچھا اچھا''۔

اور یوں ہی گپ شپ کے دوران ڈنر ختم ہوا۔

''نانو اب چلوں''۔

''ہاں بیٹا''۔انہوں نے اسکے ماتھے پر شفقت بھرا بوسہ دیا''۔تھکے ہوئے ہو سو جاؤ جاکر''۔

جواباً اس نے بھی انہیں پیار کیا۔

''شب بخیر نانو''۔

شب بخیر بیٹا''۔

اور وہ اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔

نماز پڑھی۔رات کے کپڑے پہنے اور بستر پر دراز ہوگیا۔

چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے فون کا ریسیور اٹھالیا۔

اس نے شائی کا نمبر ڈائیل کیا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اسے شائی ہی اٹھائے۔

''ہیلو''۔اسکی دعا قبول ہوئی۔دنوں بعد شائی ہی کی آواز اسکے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

''ہیلو۔شہباز بول رہا ہوں''۔

''اتنے دن کہاں تھے؟'' چھوٹتے ہی وہ بولی۔

تو ـــــ اس نے اس کی غیر حاضری نوٹ کی تھی۔

''جرمنی گیا تھا تھری ویکس کونفرنس پر''۔

آگے سے کوئی رسپانس نہ ملا۔

''ہیلو''۔وہ پھر بولا۔

''میں آپ سے بات نہیں کرتی''۔اسکی وہی پرانی خفگی عود کر آئی تھی۔

تو ـــــ شروع میں جس بے ساختگی سے اس نے اسکی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تھی وہ ـــــ اسکی غیر ارادی حرکت تھی!

وہ مسکرادیا۔ہولے سے۔

''بات کرتو رہی ہو''۔

''نہیں کرتی''۔ وہی روٹھا لہجہ۔

ساتھ ہی ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔

''چلو چھٹی ہوئی''۔ اپنے ریسیور کو تکتے تکتے وہ خود سے بولا۔

کیسی پاگل لڑکی سے واسطہ پڑا تھا!

اس کیلئے اسکے فادر کو وہ پروپوزل کیا دیگا؟ باپ کو آگے سے کہہ دے کہ 'نہیں کرنی' شادی اس سے تو؟

پھر تو بات ہی ختم ہو جائیگی۔

پہلے اسے سمجھانا پڑیگا! مگر کیسے؟ کہاں؟ ہاتھ تو آئے!

دن مختصر تھے۔ ادھر سورج نکلا ادھر دھوپ ڈھلی۔ راتیں یخ بستہ اور ہوائیں منجمد کر دینے والی تھیں۔

وہ سامنے کے ٹیرس میں کھڑا تا حد نظر پھیلی سرسوں پر نظریں جمائے تھا۔ بائیں جانب ایکڑوں پر پھیلا باغ سرخی مائل نارنجی مالٹوں سے لدا ہوا تھا۔ قد آور سفیدوں کی شاخیں لچکیلی اور ہر پرانے پتے کی گود میں نیا پتا جنم لے چکا تھا۔ خوبانی کی ننگی شاخوں پر سفیدی مائل گلابی ادھ کھلی کلیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔۔۔ اسطرف نفاست سے ترشے وسیع و عریض لان کے آس پاس لگی بوگن ولا سرخ سنہری پھولوں سے لد گئی تھی۔ تختوں میں لگے قطار در قطار زرد، نارنجی اور سیاہ مخملیں گلاب جوبن پر تھے۔ سفید گل داؤدی کی بہار امڈ آئی تھی۔ اور سرو سے لپٹی سفید پھولوں والی بیل مقناطیسی کشش کی حامل تھی۔

اکادکا بات اسکی پھر بھی شائی سے فون پر ہوئی تھی۔ مگر وہی ادھوری ادھوری سی، تشنہ تشنہ سی۔ جس سے اسکی پیاس بجھنے کی بجائے اور بڑھتی گئی، بے کلی گھٹنے کی بجائے اور سوا ہوتی گئی۔

اس سے ملے؟ اس نے سوچا۔ وہ خاک ملے گی۔ وہی بات دہرائے گی۔ 'میں بات نہیں کرتی'۔

کیا کرے؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

بہت سی لڑکیوں سے ملا تھا، دوستی ہوئی تھی، ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر۔۔۔

ایسی بے ڈھب لڑکی سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا!

وہ شاید اسے بچوں کا ایک کھیل سمجھ رہی تھی کہ اس نے فون کیا۔ اس نے اٹھایا اور 'بات نہیں کرتی' کہہ کر بند کر دیا۔ اتنی بھولی تھی کہ وہ یہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ اس [illegible] تو اسکے اشتیاق کو

اور ہوا مل رہی تھی، اور بے تاب ہو رہا تھا وہ!

وہ جھنجھلایا۔ وہ تو اس کیلئے پاگل ہو رہا تھا اور یہ تھی کہ سوئی 'نہیں بولتی' سے آگے بڑھ ہی نہیں رہی تھی۔ معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی۔ بات کی سنجیدگی سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

اسکا دل چاہا اسے پکڑ کر بچوں کی طرح پیٹ ڈالے۔ تبھی شاید وہ سیدھے راستے پر آتی۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ آج اسکا ڈے آف تھا۔ بیرا اسے اسکے بیڈروم میں کوفی رکھ دینے کی اطلاع دینے آیا تو وہ چونکا۔ گہری سانس لیتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ کوفی پیتے پیتے وہ ٹی وی پر نیوز دیکھ رہا تھا۔ ذہن اب بھی شائی کی طرف پلٹ پلٹ جاتا۔ کوفی ختم کی تو الجھا الجھا سا اٹھا۔ اور آج دن میں اسکا نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

''جی۔ کون صاحب ہیں''۔ پھپھو تھیں۔

''شائی ہیں۔ میں شہباز بول رہا ہوں''۔

اسے اپنے اوپر حیرت ہوتی تھی۔ بڑی بڑی ڈیلنگو کرتا تھا وہ پر پھپھو کے آگے کچھ مدھم سا پڑ جاتا تھا۔ شاید شائی سے غیر قانونی بات چیت کی وجہ سے۔

''جی ہے مگر کچھ مصروف ہے۔ آپ مجھے پیغام دیدیں''۔ پھر انکا لہجہ قدرے معذرت خواہ ہوا۔ ''دراصل ہم بس تھوڑی دیر میں روانہ ہو رہے ہیں برف باری دیکھنے۔ وہ پیکنگ میں مصروف ہے''۔

''اوہ۔ کوئی خاص پیغام نہیں بس خیریت پوچھنا تھی۔ آپ بتا دیجئے گا''۔

''جی میں بتا دونگی''۔

برف باری!

یقیناً کوئی ہل سٹیشن!

کہیں وہی تو نہیں!

اور اسکی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں جگنو جگمگا اٹھے۔ وہ وہیں جائیگا۔ اسے وہیں گھیرے

گا۔ اس سے بہتر اور کوئی موقعہ نہیں تھا!

ہر بات میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ آج خلاف معمول اس نے دن میں وہاں فون کیا اور موقعہ پر انہیں جا لیا اور پھر فون بھی پھپھو نے اٹھایا اور انجانے میں اسے شائی کے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ شائی خود اٹھاتی تو کبھی اپنے پروگرام کا نہ بتاتی۔

اور کل کے اپنے بہت سارے اپوائنٹمنٹس کینسل کرواتے ہوئے اس نے اپنے پی اے کو کل ہل سٹیشن پر جانے کے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

اسی چند ماہ قبل والے لکڑی کے بنے خوبصورت سے پہاڑی ریسٹورانٹ میں کوفی پی کر وہ باہر نکلا۔

اوپر نگاہ کی!

ہوٹیل کے اوپر تلے، ادھر ادھر بکھرے خوبصورت سوئیس کی سرخ کھپریل کی ڈھلانی چھتیں برف سے ڈھکی پڑی تھیں، میجسٹک پائینز برف کا لبادہ اوڑھے تھے، لانبی لانبی لہلہاتی سرسراتی گھاس اس وقت برف کی تہوں کے نیچے دبی تھی۔

ہر طرف برف ہی برف اوپر سے چاروں اور لٹکے بادل اور مزید برف اب برسی کہ اب برسی۔

واہ ـــ کیا حسن تھا! وہ مسحور ہو گیا۔

وہ رات ہی یہاں پہنچا تھا۔ بالکل اکیلا۔ بابا کے بھی بغیر۔

رات ریسپشن میں اپنا چیک ان کرتے کرتے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا شائی اس سے پہلے پہنچ چکی تھی اور سویٹ نمبر سات میں ٹھہری تھی ـــ اور بڑے آرام سے اس نے اپنے لئے سویٹ نمبر چھ حاصل کر لیا تھا کہ پورے ہوٹیل میں اسکے اور شائی کے علاوہ صرف ایک فیملی اور آئی تھی جو سویٹ نمبر ون میں مقیم تھی۔

بالکل اسی طرح ایک بار پہلے بھی وہ اسکی تلاش میں آیا تھا۔ مگر ـــ کتنا فرق تھا تب کے احساسات میں اور ـــ آج کے محسوسات میں!

تب وہ جیسے اسکی جان کا دشمن تھا اور ـــ آج وہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی!

تقریباً سارا دن وہ اپنے کمرے میں کتاب پڑھتا رہا یا پھر سویٹ کے پچھواڑے کھائی

کے کنارے پل بھر کی دھوپ میں آرمڈ چیئر پر نیم دراز قدرت کے انوکھے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

سویٹ کے سامنے کی طرف وہ جان بوجھ کر نہیں آیا۔ کیونکہ کھلے پردوں میں سے کھڑکی کے اس پار اس نے دیکھا تھا شائی اور اسکی پھپھو گاہے گاہے اپنے برآمدے یا پھر اوپر نیچے آتی جاتی نظر آتی تھیں۔ اس نے اپنے کو پوشیدہ رکھنا ہی بہتر سمجھا کہ۔

مبادا پاگل لڑکی اسے دیکھتے ہی بدک جائے!

شام کے چار بجے تھے، دن ڈھلنے لگا تھا، پہاڑی علاقوں میں شامیں بہت جلدی بھی اتر آتی ہیں۔

وہ اس وقت بھی سویٹ کے پچھواڑے آرمڈ چیئر پر بیٹھا تھا۔ اردگرد کے سوئیس کی برف سے ڈھکی چھتیں نارنجی ہو رہی تھیں، نیچے کھائی میں اگے سر بفلک پائین کے برف پوش درخت ڈھلتے سورج کا روپ چرائے لئے جا رہے تھے اور ـــ پوری شام سیندوری ہو رہی تھی!

معاً وہ چونکا ـــ جانے کہاں سے بھٹکتی شائی اسکے سویٹ کے پچھواڑے آنکلی تھی۔ اس سے چار پانچ گز کے فاصلے پر احتیاط سے قدم رکھتی اردگرد سے بے خبر آہستہ آہستہ اسی کی اور چلی آرہی تھی۔

اسکے لبوں پر دلنشیں مسکراہٹ ابھر آئی۔ آہستہ سے اپنی کرسی سے اٹھا اور دو قدم چلتا اسکے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"آ... آپ"۔ سر اٹھاتے ہی وہ گھبرا کر بولی۔

اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلایا۔ مخصوص مدھر مسکراہٹ گہری ہو گئی، پرکشش آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔

وہ راستہ بدل کر آگے نکلنے لگی۔ اس اچانک مڈبھیڑ کیلئے جیسے وہ تیار نہیں تھی۔

"نہیں"۔ بازو پھیلاتے ہوئے اس نے اسکا راستہ روک لیا۔

پھر اسے ہاتھ سے تھام کر کرسی تک لایا۔

‘‘بیٹھو یہاں’’۔

وہ سہمی سی بیٹھ گئی۔ اتنا بڑا بھی تو تھا اس سے۔ پھر اتنے رعب سے بھی کہہ رہا تھا۔

‘‘اب۔۔۔ باتیں کرو مجھ سے’’۔ وہ قریب کھڑا تھا۔

‘‘کیا بات کروں’’۔ سر جھکائے وہ دھیرے سے بولی۔ اسکی ساری اکڑ ہوا ہو رہی تھی۔

اسے ہنسی آ گئی۔

‘‘یہاں کیا کرنے آئی تھیں’’۔ وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

‘‘وہ... بندر آیا تھا اس طرف’’۔

وہ نیچے دیکھ رہی تھی۔ چہرہ پھولا پھولا سا تھا اور لہجے میں پھر روٹھا پن تھا۔

‘‘اُسے دیکھنے آئی تھیں’’۔ وہ اپنی ہنسی بمشکل روک رہا تھا۔

‘‘ہاں’’۔ وہ ہنوز نیچے دیکھ رہی تھی۔ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

‘‘آؤ دیکھیں اسے’’۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اسے ہاتھ سے تھام لیا۔

بے چوں و چرا وہ ساتھ ہو لی۔

‘‘کس طرف آیا تھا؟’’ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

‘‘اسی طرف۔ نیچے کھائی میں چلا گیا ہوگا’’۔

اور شہباز خان نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے نیچے کھائی میں دیکھا۔ واقعی وہیں بندر برف میں ادھ ڈھکی ایک جھاڑی سے سرخ سرخ بیری نما پھل کھانے میں مصروف تھا۔

‘‘یہاں تشریف فرما ہے۔ کوئی پیغام دو گی’’۔

اسکی بات پر وہ ہنس دی۔ خوبصورت موتیوں جیسے دانت بہت بھلے لگ رہے تھے۔

وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ مسحور سا۔

‘‘اے’’۔ وہ ہولے سے بولا۔ اب تک اسکا ہاتھ پکڑے تھا۔

اسکی جھکی پلکیں اوپر اٹھیں۔ ایک پل کو اسے دیکھا، پھر اسکی بولتی نظروں کا تاب نہ لاتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

‘‘تم بہت خوبصورت ہو’’۔ وہ دھیرے سے بولا۔

اس سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ مگر کوشش ناکام ہو گئی۔

‘‘میرا ہاتھ چھوڑ دیں’’۔

‘‘سنو’’۔ اسے یہی موقعہ غنیمت لگا۔ بات ان سنی کر دی۔ ہاتھ اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا۔

‘‘تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ اور میں اس سلسلے میں تمہارے فادر سے بات کرنا چاہونگا’’۔ وہ متانت سے بولا۔

‘‘کیا بات کرینگے’’۔ وہ گھبرا کر بولی۔ کیا وہ انہیں اس افیئر کے بارے میں بتائیگا؟

‘‘یہی۔۔۔ کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور تمہاری شادی مجھ سے کرا دیں’’۔

اب وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ سرخ ہوتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ چھڑا ہی لیا۔

‘‘میں... میں آپ سے نہیں بولتی’’۔ اسے پھر اپنی ناراضگی یاد آ گئی۔

‘‘کیوں؟’’

‘‘بس۔ میں آپ سے خفا ہوں’’۔

‘‘کیا کیا ہے میں نے’’۔ اس کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ تھی۔

‘‘وہ... بس۔ کچھ نہیں’’۔ اس نے جانے کو قدم بڑھائے۔

کیسے کہتی اسے کہ وہ اس سے اسلئے خفا تھی کہ اس نے اسے پیار کرنا سکھا کر بے دردی سے منہ موڑ لیا تھا۔

‘‘پلیز رک جاؤ’’۔ اسکے لہجے میں التجا تھی۔ ایک بار پھر اسکا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اسے رکنا ہی پڑا۔

‘‘میں صرف تمہارے لئے یہاں آیا ہوں، کئی ضروری کام چھوڑ کر’’۔

اس نے اسے بہت دکھ دیئے تھے۔ نادیہ کو الگ لئے لئے پھرتا تھا۔ وہ سب کیا تھا؟

‘‘مت آتے’’۔ اس کے لہجے میں ناراضگی، خفگی کے ساتھ ساتھ غصہ عود کر آیا۔

وہ پھر سے ہاتھ چھڑانے لگی۔ جانے کیلئے قدم بڑھائے۔

''بہت خفا ہو''۔اسکا ہاتھ اس نے نہیں چھوڑا۔

''مجھے نہیں پتہ''۔

''اچھا معاف کردو مجھے۔پلیز...''۔

اور کوئی اور راستہ نہ پا کر اس نے اپنے خوبصورت دانت اسکے ہاتھ میں گاڑھے اور گرفت ڈھیلی ہوتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔

کیا چیز تھی! وہ اپنے ہاتھ کو تکتا رہ گیا۔

بہت سنجیدگی سے اس سے خفا تھی وہ! سوچوں میں گم اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے وہ وہیں کھڑا رہا۔ہوش آیا۔آس پاس، اردگرد نگاہ ڈالی۔

سورج ڈوب چکا تھا۔مخالف سمت سے پورا چاند پورے آب وتاب سے نمودار ہو رہا تھا۔اور تاحد نظر بکھری برف پر دودھیا چاندنی اپنا اجالا پھیلا رہی تھی۔

منجمد کردینے والی سردی چبھنے لگی تو وہ اندر کمرے میں چلا آیا۔

رات ڈنر کے بعد وہ کافی دیر تک کتاب پڑھتا رہا۔گاہے گاہے ذہن شائی کی طرف پلٹ جاتا۔رات سونے لیٹا تو بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔شائی کا خیال اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔

آج صبح سے بارش ہو رہی تھی۔دس بجتے بجتے برف گرنا شروع ہوگئی۔

رین کوٹ پہنے، چپ چاپ خاموشی سے پڑتی روئی کے گالوں جیسی برف سے لطف اندوز ہوتا وہ چھوٹے سے بازار سے واپس آرہا تھا۔

معاً اسکی نظر بائیں طرف قدرے اونچائی پر ایک غار کے اندر پڑی۔

وہیں شائی تھی۔تیزی سے گرتی برف سے پناہ لی تھی شاید۔

تیز تیز قدم بڑھاتا وہ غار میں آگیا۔اسے اچانک وہاں دیکھ کر پہلے تو اسکی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں اور پھر یکبارگی جگہ ناراضگی نے لے لی۔

''گڈ مورننگ میم''۔وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

''ہیلو''۔اسے جواب دینا ہی پڑا۔

''تم ___ اکیلی کیوں نکلتی ہو۔کسی کو ساتھ کیوں نہیں لیتیں''۔اسے اسکا ایسے موسم میں اور پھر ٹورسٹس نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سنسان راستوں میں گھومنا پھرنا صحیح نہ لگا۔

وہ خاموش رہی۔وہ خود بھی کافی دیر سے پچھتا رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے یہ شیر کا غار ہے۔اچانک آگیا تو''۔

وہ سب ناراضگی بھول بھال گئی۔رنگ سفید پڑ گیا۔دو قدم اسکی طرف بڑھ آئی۔

گرمیوں میں وہ آتی تھی تو یہاں شیر کی موجودگی کا تذکرہ عام سنتی تھی۔

اسے ہنسی آگئی۔یہ تو حال تھا!

''خواہ مخواہ مجھ پر رعب ڈالتی ہو ورنہ...''۔

وہ اوپر سے نیچے تک اسے دیکھ رہا تھا۔نظروں میں شوخی تھی، شرارت تھی اور بے شمار

کہانیاں!

وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

"تم نے میری کل والی بات پر کچھ سوچا"۔ وہ اپنے مطلب پر آ گیا۔

وہ باہر دیکھنے لگی۔ جواب کوئی نہیں دیا۔

"دیکھو میں سیریس ہوں۔ مجھے جواب چاہیئے"۔

"میں... میں... میں کیا کہوں"۔

"Do you love me."۔ وہ اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

اور اسکا رنگ سرخ ہو گیا۔ چہرہ باوجود سردی کی شدت کے تپنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم"۔

کس قدر ضدی تھی۔ اپنی ایک ہی ہٹ پر قائم تھی!

ہاتھ بڑھا کر اس نے اسے بازو کے حلقے میں لیا، اس کا سر اپنے پہلو سے لگایا، اسکی بند بند آنکھوں میں جھانکا۔

"You do love me."۔ اس نے آہستہ سے اپنے ہونٹ اسکے ماتھے پر رکھ دیئے۔ "منہ سے نہیں کہتیں الگ بات ہے"۔

خجل سی ہوتے ہوئے وہ الگ جا کھڑی ہوئی۔

پھر جانے کہاں سے اسے اچانک اسکا نادیہ کے ساتھ گھومنا پھرنا یاد آیا۔ اپنا رونا کڑھنا اور پھر یہ سٹیشن ہی چھوڑ دینا یاد آیا۔

اگر وہ اتنا ہی اس کیلئے سیریس تھا۔ تو اتنا رلایا کیوں تھا؟ تڑپایا کیوں تھا؟

نادیہ کیساتھ پیچھے رہ کر کچھ کم رنگ رلیاں منائی ہونگی؟

"I have never liked you. I don't like you."

"جھوٹ کیوں بول رہی ہو"۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپکو خواہ مخواہ غلط فہمی ہو رہی ہے"۔

وہ مسکرا دیا۔

"تم Accept کیوں نہیں کر لیتیں۔ تم کو مجھ سے، پیار ہے"۔

"نہیں ہے۔ کہانا آپکو خوش فہمی ہے"۔ اسکے لہجے میں طنز ابھر آیا۔

ہاتھ سے تھامتے ہوئے وہ اسے اپنے قریب لے آیا۔ آہستہ سے سینے سے لگا لیا۔

"ٹھیک ہے تم مجھے Like نہیں کرتیں مگر ـــ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ"۔

اسکے مہکتے بال ہاتھ سے سنوارتے ہوئے اس نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

وہی ایک بار پہلے والی اسکی مخصوص مدھر مسحور کن مہک تھی، وہی مدہوش کن گرم گرم سانسیں تھیں، وہی جادوئی قرب تھا ـــ بالکل وہی تھا سب کچھ جب وہ اسے اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا کر سویٹ تک لایا تھا۔

وہ موم ہونے لگی، پگھلنے لگی۔ مگر ـــ جلد ہی اسے ہوش آیا۔

اس نے اسکے انجان دل کو محبت کے جذبوں سے روشناس کرا کر بغیر کسی قصور، بغیر کسی غلطی کے توڑ پھوڑ ڈالا۔ نادیہ سے دوستی کی پینگیں بڑھا کر اسکے ٹوٹے پھوٹے دل کو مزید مسل مسل کر، ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا۔ اسطرح۔

کہ وہ مدتوں اسکے ذرے چنتی رہی تھی، ریزے اکٹھے کرتی رہی تھی ـــ رو رو کر، سسک سسک کر!

اس نے اسکی ناتواں جان پر ناقابل تلافی ظلم ڈھائے تھے۔ وہ اپنا درد، اپنا کرب بھلا نہیں سکتی تھی!

"آپ مجھے نہیں چاہتے"۔ سختی سے کہتے ہوئے وہ الگ جا کھڑی ہوئی۔

وہ دم بخود سا رہ گیا۔

"اور آپ آئندہ مجھے ملنے کی بھی کوشش مت کیجیئے گا"۔ اسکا زہر میں بجھا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

وہ سن سا رہ گیا۔

وہ تو سمجھا تھا وہ اسے منائیگا اور وہ مان جائیگی۔ کہ اسے یقین تھا وہ اس سے پیار کرتی تھی

لیکن ——

اس قدر نالاں تھی وہ اس سے، اس قدر بےزار!

اسکے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

اسکے پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے، سیاہ نشیلی آنکھیں کربناک لگنے لگیں، سر گھوم سا گیا۔

اور پھر—— اسے مزید منانا اسے بیکار لگا۔

چند پل وہیں کھڑا اسے تکتا رہا۔

"Ok. I won't disturb you again." اسکا لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔

اور—— بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہاں سے چلا آیا۔

برف اب بھی پڑ رہی تھی مگر۔ شائی غار سے نکل آئی۔ پریشان سی سوچوں میں غلطاں سویٹ پر آگئی۔

لنچ کے بعد بستر پر لیٹی—— تو خاصی بےکل تھی۔

دل کڑا کر کے اس نے اس سے سختی تو برتی تھی۔ مگر اس وقت اپنے رویے پر نادم سی بھی تھی۔ اس نے اسے آئندہ نہ ملنے کا کہا تھا تو اسکے پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے تھے، سیاہ نشیلی آنکھیں کربناک لگنے لگی تھیں۔

"Ok. I won't disturb you again." اس نے کہا تھا تو اسکی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

کیسے اس نے اسے اتنا کچھ کہہ دیا تھا؟ اپنی محبت سے، اپنی زندگی سے ایسا برتاؤ کیسے کر لیا تھا اس نے؟

وہ تو پل پل اسکی یاد میں جی رہی تھی۔ عرصہ بعد اس سے فاروق کے ذریعے گاڑی میں ملی تھی تو اسے دیکھ کر اسے لگا تھا وہ جی اٹھی تھی۔ اسکے فون آنے لگے تھے تو وہ اپنے آپکو ساتویں

آسمان پر پا رہی تھی۔ ہر پل ہر لمحہ اسکے فون کا انتظار رہتا تھا—— وہ جرمنی بزنس ٹور پر گیا تھا تو وہ دن اس نے انگاروں پر لوٹ کر گزارے تھے۔ لگتا تھا جی اٹھنے کے بعد دوبارہ ختم ہو گئی تھی۔ جرمنی سے واپسی پر اس نے فون کیا تھا تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ سوچتی تھی وہ نہ ملا تو جی نہ پائے گی۔ مر جائے گی۔ پھر——

آج کس دل سے اس نے اسے آئندہ ملنے سے منع کیا تھا؟

وہ شادی کی پیشکش کر رہا تھا تو اسے مان لینا چاہیے تھا کہ وہ جانتی تھی وہ اسکے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر——

یہ اتنی ساری بےرخی کیوں؟ اتنی ساری اکڑ کیوں؟ اور اتنی ساری بیزاری کیوں؟

اسے ملنے سے منع کر تو دیا تھا مگر کیا وہ اس سے ملے بنا جی پائیگی؟

"شائی۔ بیٹے اٹھو۔ صاحبو نے گرم گرم شامی کباب بنائے ہیں۔ ٹھنڈے ہو جائینگے"۔ پھپھو اس کے کمرے میں آتے ہوئے بولیں۔

اسکی نظر گھڑی پر گئی۔ شام کے چار بج چکے تھے۔ سورج ڈھلنے کو تھا اور اسے پتہ تک نہیں چلا تھا۔

"جی پھپھو"۔ وہ بستر میں بیٹھ گئی۔ "یہیں منگوا دیں نا"۔

"اچھا۔ صاحبو——" وہ وہیں سے پکاریں۔ "یہیں لے آؤ چائے"۔

صاحبو نے وہیں اسکے بستر کے آگے میز پر چائے لگا لی۔ کباب کیساتھ کیچپ بھی تھا۔

دونوں مزے لے کر کھانے لگیں۔

"پاس والے سویٹ میں شہباز خان آ کر ٹھہرے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے"۔ پھپھو اسکا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

کہ—— اس سے قبل وہ اکثر شائی کو فون کرتا تھا اور چونکہ پھپھو کو وہ دل سے اسکے لئے پسند تھا اسلئے اسکے کسی فون کال پر انہوں نے کبھی برا منایا نہ شائی سے کوئی باز پرس کی۔

"جی۔ نہیں تو"۔ وہ صاف مکر گئی۔

اسکے فون آتے تھے تو وہ پھپھو سے آنکھیں چراتی پھرتی تھی آج کیسے اقرار کرتی۔ اسے حیرت بھی تھی پھپھو نے کبھی اس کے فون پر کوئی اعتراض نہیں کیا؟ نہ ہی کبھی پوچھا کہ وہ کیا کہتا ہے؟

"اچھا۔ ویسے پرسوں رات وہ بھی آیا ہے۔ صاحبو کہتا تھا بیرا بتا رہا تھا شہباز خان آئے تو ایک ہفتے کے ارادے سے تھے مگر اچانک جانے کیا ہوا کل صبح سویرے ہی واپسی کا پروگرام بنالیا"۔

شائی کا دل دھک سے رہ گیا۔ ضرور اسی کے رویے کی وجہ سے دل برداشتہ ہو کر پروگرام بدلا تھا۔

وہ چلا جائیگا اور یقیناً اسے دوبارہ نہیں ملے گا۔ وہ اپنی بات کا پکا لگتا تھا۔

پھر ـــ کیا کریگی وہ؟ وہ تو زندہ تھی کہ اسکا فون آنے لگا تھا۔ اسکی آواز سننے کو ملتی تھی۔

یہ سب بند ہو گیا تو وہ کیسے جیئے گی؟

پھپھو نے باتوں کا رخ بدل دیا تھا مگر ـــ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی۔ اب کیا ہوگا؟ کیا کریگی وہ؟ ایک بار پھر کیا اسکے بنا رہ سکے گی؟

پھر ـــ اتنی اکڑ کیوں دکھاتی تھی؟

خفا بھی تو تھی اس سے۔ اس نے اسکا دل بھی تو توڑا تھا۔

پر ـــ مداوا بھی تو کر رہا تھا، تلافی بھی تو کر رہا تھا، معافی بھی تو مانگ لی تھی!

جوں جوں وقت گزرتا گیا اسکی بے چینی بڑھتی گئی۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بڑا سا چاند اپنی دودھیا چاندنی سے پوری وادی پر اجالا پھیلا رہا تھا۔ یہاں وہاں، اوپر تلے، جمیں برف کی تہیں اجاگر ہو رہی تھیں۔

عجیب سحر زدہ ماحول تھا۔ اور اس سحر میں جکڑا شہباز خان اپنے سویٹ کے پچھواڑے درخت سے ٹیک لگائے جانے کب سے کھڑا تھا۔

دفعتاً وہ آہٹ پر چونکا۔

سامنے دیکھا۔ شائی تھی۔

دھیرے دھیرے اسکی طرف بڑھ رہی تھی۔

پاس آگئی۔ رک گئی۔

"کیا بات ہے"۔ وہ دھیرے سے بولا۔

"آپ... آپ... نہیں جائینگے"۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔

پھر اتنا روئی اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔

شہباز خان نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ بار بار اسکے بالوں پر ماتھے پر پیار کیے جا رہا تھا۔ اسکے آنسو پونچھ رہا تھا۔ چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر بے سود۔

وہ تو جیسے آج ہی ساری کسر نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔

اسکے آنسو شہباز خان کے نائیٹ سوٹ میں سے ہوتے اسکے سینے کو بھگو رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے ہچکیاں لے رہی تھی۔

"بس۔ پلیز ـــ چپ ہو جاؤ"۔ اس نے اسکے ماتھے پر گھر آئے بالوں کی لٹ ہٹائی، پیار کیا۔

"آپ... آپ نہیں جائینگے"۔ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

"اچھا۔ نہیں جاؤنگا"۔

"کیوں جانے کا پروگرام بنایا تھا"۔ وہ بھیگے گال پونچھنے لگی۔

"غلطی ہوگئی"۔ وہ مسکرادیا۔

"پھر ایسا نہیں کرینگے"۔ وہ ہچکی لیتے ہوئے بولی۔

"نہیں کرونگا"۔

"اب چھوڑ کر گئے تو میں مرجاؤنگی"۔ اس نے دوبارہ اسکے سینے میں سر چھپا لیا۔

"تم تو میری زندگی ہو تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں"۔ اس نے اسے اپنے مضبوط

بازوؤں میں جکڑ لیا۔

چاند نیلے گگن پر دھیرے دھیرے اوپر بڑھ رہا تھا۔ ہر سو پرسکون چاندنی پھیل رہی تھی۔ سردی منجمد کر دینے والی تھی۔

وہ اسے بازو کے حلقے میں لئے لئے قریب پڑی کرسی کی طرف لے آیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا، شائی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسکا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"پھر مجھ سے دور جانے کا کہا ناتو..."۔

"میرے باپ کی بھی توبہ"۔ اس نے کان کو ہاتھ لگایا۔

پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں پتہ ہے میرا کوئی باپ نہیں"۔ وہ بے طرح اداس ہو گیا تھا، دکھ اسکی آنکھوں سے جھانک رہا تھا، درد آواز تک میں اتر آیا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے تکنے لگی۔

"ہاں"۔ اسکا لب ولہجہ تلخ ہونے لگا۔ "I am an illegitimate child of my parents."

اسے معلوم تھا۔ یہیں ہل سٹیشن پر اس نے اسے یہی بات نادیہ کو بتاتے سنا تھا۔ تب بھی وہ اتنا دکھی ہو رہا تھا۔

اس وقت پھر کرب میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔

اور آج ایک بار پھر اسکا دُکھ، اسکا کرب اسکے من میں اترنے لگا۔ تمام درد دل میں سمونے کی تو پیمانے چھلک اٹھے۔

"میں کچھ جاننا نہیں چاہتی"۔ اس نے اسکا ہاتھ تھامتے ہوئے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"میں صرف آپکو جانتی ہوں اور بس۔ مجھے آپ چاہیئے اور کچھ نہیں۔ آپ کون ہیں کیا ہیں یہ میں جاننا نہیں چاہتی"۔ اس کے آنسو اسکا ہاتھ بھگو رہے تھے۔

"تم کیوں رونے لگیں"۔ اسکی آواز میں گہری گھمبیرتا تھی۔

"آپ کیوں اداس ہیں"۔ اسکا ہاتھ اپنے گال سے لگاتے ہوئے وہ مزید رو دی۔

اس نے گہری سانس لی۔ دکھ تھا جس میں، اداسی تھی جس میں۔

"میری تو قسمت میں یہ سب لکھا ہے"۔

"پلیز ایسا مت کہیں۔ اپنے دکھ اپنی پریشانیاں مجھے دیدیں۔ آپ ہنستے رہیں، خوش رہیں"۔ وہ ہچکیاں لینے لگی۔

اسکا دکھ لامتناہی تھا، وہ سہہ نہ پائی!

شہباز خان چونکا۔ اپنی باتوں سے اس نے شائی کو پریشان کر دیا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے میں نے پچھلی بار تم سے کیوں ایسا رویہ رکھا تھا؟" اسکے بھیگے گال انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے وہ اس سے روا رکھے گئے اپنے سابقہ رویے کا ذکر کرنے لگا۔

"کیوں رکھا تھا؟" آنسوؤں کے درمیان وہ بے تابی سے اسے دیکھنے لگی۔

کہ یہ سوال بارہا اسکے ذہن میں اٹھا تھا!

"تمہیں شاید معلوم نہیں ـــــ میں نے تمہیں کچھ عرصہ قبل امریکہ میں مسٹر نذیر احمد کے یہاں ڈنر پر دیکھا تھا۔ تم مجھے اچھی لگیں۔ میں نے اپنی نانو کو فون پر بتایا۔ انہوں نے ہماری ایک ماما ہیں انہیں تمہارے یہاں بھیج دیا کہ اگر تمہارے گھر والوں کی مرضی ہو تو نانو تمہارا رشتہ لے کر جائیں۔ تب تک میں بھی واپس آ چکا تھا..."۔

اس نے اسے ساری بات بتادی کہ کس طرح ماما گئیں، اس کے والد نے کیا کہا اور نادیہ نے ماما سے کیا کہا۔ جسے ماما شائی سمجھ کر واپس لوٹیں۔ اور کسطرح وہ اپنے بارے میں ایسے الفاظ سن کر نہ صرف پہلی بار اپنی پیدائش کے حقائق جان سکا بلکہ مرتے مرتے بچایا گیا۔

شائی حیرت سے اسے تک رہی تھی۔ اسے معلوم تھا نادیہ اس سے جیلس تھی مگر اتنی نیچ بات بھی کر سکتی تھی اسکے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا!

اچانک اسے یاد آیا۔

"کون ہے ویسے؟" پہیں گرمیوں میں نادیہ جب اسے ملنے آئی تھی تو اس نے شہباز خان کو نیچے ریسٹورانٹ سے اوپر سویٹ کی طرف آتے دیکھنے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"کوئی انڈسٹریلسٹ ہے۔ شہباز خان نام ہے"۔ اس نے کہا تھا۔

"اوہ"۔ وہ کچھ چونک سی گئی تھی۔ پھر جلدی ہی سنبھل گئی تھی۔ "کبھی ملواؤ نا"۔

تو۔۔۔ وہ پہلے سے جانتی تھی اسے!

اور۔۔۔ کچھ سوچ کر ہی اسکے یہاں قیام کیا تھا!

اسی شام نیچے پارک کے آگے اسے ملی تھی۔

پھر۔۔۔ سرشار تھی، مسحور تھی، نشہ سا طاری تھا اس پر۔

وہ سارا وقت اسی کی باتیں کرتی رہی تھی۔ ٹی وی کے آگے بھی، ڈنر پر بھی، رات گئے تک بھی۔

ایک بات تب بھی شائی نے محسوس کی تھی۔ نادیہ اسکا ذکر فاتحانہ انداز میں کر رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی تھی تم جس سے بات تک نہ کرسکیں میں نے اسے متوجہ بھی کرلیا ہے۔

'I want to make friends with him.' اگلے ہی دن شہباز خان کے ملازموں سے اسکے نیچے ریسٹورانٹ میں کوفی پینے جانے کے متعلق سنتے ہی وہ اسکے پاس آکر بولی تھی۔ 'Wish me good luck.' اس نے مزید کہا تھا۔

اور۔۔۔ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔

وہ پگڈنڈی پر نیچے چل دی تھی۔ شائی کو اپنی طرف دیکھتے پاکر ہاتھ ہلایا تھا۔

اُس وقت پھر شائی کو محسوس ہوا تھا وہ اسے فاتحانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

تب شائی نے سوچا تھا۔ اس سے ملنا، اس سے باتیں کرنا، اسکا قرب حاصل کرنا، ایک دنیا کو فتح کرنے کے مترادف ہی تو تھا۔

پر اب بھی وہ شہباز خان کو فتح کر کے شائی کو زیر کرنا چاہتی تھی!

یہ بھی اسکی مرضی، اسکا ذاتی معاملہ تھا۔ ٹھیک تھا جو بھی کر رہی تھی مگر۔۔۔

اتنی گری ہوئی بات کرے گی اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

اس بات کی وجہ سے شہباز خان پر کیا گزری تھی!

وہ اپنے آپکو مجرم سمجھنے لگی۔ اور بھی رو دی۔

"پلیز شہباز مجھے معاف کردیں۔ پلیز! مجھے نہیں پتہ تھا میری وجہ سے آپ نے اتنے دکھ اٹھائے ہیں..."۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ افسردگی کم ہونے کے باوجود موجود تھی۔

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ وہ بات تم نے تو نہیں کی تھی"۔

"پھر بھی۔ ہوئی تو میری ہی وجہ سے"۔

"بس۔ بھول جاؤ۔ آؤ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں"۔ اس نے اسکے آنسو پونچھے۔ مسکرایا۔

"مجھ سے شادی کرو گی نا"۔

"یہ اچھی بات ہے"۔ اسے ہنسی آگئی۔

"اس سے بڑھ کر اچھی اور کیا بات ہوگی ۔۔۔ کرو گی نا"۔

"آپ... پاپا سے بات کریں"۔ وہ شرماتے شرماتے بولی۔

آنسوؤں کے درمیان اسکی بھیگی بھیگی، شرمیلی شرمیلی مسکراہٹ اسے بے خود کرگئی۔

دھوپ چھاؤں کا یہ امتزاج بہت حسین تھا۔

اس نے باری باری اسکی متورم آنکھیں چوم لیں۔

"یہاں سے جاتے ہی بات کرونگا۔ میں تمہارے بغیر ادھورا رہتا ہوں"۔

وہ چپ تھی اب بھی لجائی لجائی سی۔

"اے۔ تم مجھ پر رعب کیوں ڈالتی تھیں۔ بات نہیں کرتی، یہ نہیں کرتی وہ نہیں کرتی..."۔

اسے یکدم خیال آیا۔

"آپ کیوں مجھے اتنا رلاتے تھے"۔

'اچھا بتاؤ تم یہاں سے اچانک واپس کیوں چلی گئی تھیں"۔

"میں آپکو نادیہ کیساتھ اور گھومتے پھرتے نہیں دیکھ سکتی تھی"۔

چند لمحے وہ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔شائی کی سرخ ہوتی پر پلش حسین آنکھیں اس پر جمی تھیں۔

"تم اتنی خوبصورت کیوں ہو"۔وہ اچانک بولا۔

"آپ... اتنے ہینڈسم کیوں ہیں؟"

اور ـــ ایک بار پھر شہباز خان کے ذہن میں سوال اٹھا ـــ اسکی شکل کس پر گئی تھی؟ اس مرد پر جس نے اس گناہ کا بیج بویا تھا یا اس عورت پر جس نے اس گناہ کو جنم دیا تھا؟

یہ اذیت ناک سوال بارہا اسکے ذہن میں ابھرا تھا مگر اس نے کبھی نانو سے پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔وہ اس خوفناک سوال کا حوصلہ اپنے میں نہیں پاتا تھا۔

کتنی بے بسی تھی ایک معصوم انسان کی کہ وہ اپنی شکل جاننے کے بارے میں اپنا منہ نہیں کھول سکتا تھا؟ اسے اپنے آپ پر ترس آنے لگا!

"شائی"۔

"جی"۔وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اسکی سیاہ دلنشیں آنکھوں میں وحشت سی چھا گئی تھی۔

"ایک وعدہ کرو۔ہماری گفتگو میں میری تخلیق سے متعلق کبھی کوئی ذکر نہیں آئیگا"۔اسکا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

اوہ ـــ کس قدر ٹوٹا ہوا تھا یہ انسان اندر سے!

"پرومس۔آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا"۔

معاً شہباز خان کی نگاہ نور کی کرنیں بکھیرتے چاند پر پڑی۔وہ تیزی سے آگے ہی آگے رواں دواں تھا۔

"شائی۔تم اپنے سویٹ پر جاؤ۔تمہیں زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم لوگ واپس کب جا رہے ہو"۔شہباز خان اٹھتے ہوئے بولا۔

"پرسوں"۔

"ٹھیک ہے میں بھی پرسوں چلا جاؤنگا۔اور... کل ملوگی نا"۔

"ہاں"۔اسکی نظریں جھک گئیں۔

"کہاں ملوگی"۔

"کیا پتہ"۔

اسے اچھا لگا۔مسکرا دیا ـــ اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔وہ ہی اسکا پہلا پیار تھا!

"نیچے ریسٹورانٹ میں آنا۔گیارہ بجے میں کوفی پینے جاؤنگا"۔

"اچھا"۔اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آؤ تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں"۔اسے کندھے سے تھامتے ہوئے وہ لے جانے لگا۔

اسکا سویٹ سامنے آ گیا۔

"گڈ نائیٹ"۔اس نے اسے Kiss دیا۔

"گڈ نائیٹ"۔وہ آگے بڑھ گئی۔

اگلے دن وہ ریسٹورانٹ میں اپنی مخصوص کونے والی ٹیبل پر بیٹھا اسے اپنا منتظر نظر آیا۔ اوورکوٹ اور لونگ شوز میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اسکی مخصوص مدھر پرفیوم ماحول کو خواب آور بنا رہی تھی، اسکا دبدبہ آس پاس کی فضا کو مرعوب بنا رہا تھا، اور اسکا حاکمانہ انداز جیسے پورے علاقے کو محکوم بنا رہا تھا!

پل بھر کو وہ بھی محسور ہوگئی۔۔۔ مگر اگلے ہی لمحے اسکی اپنائیت بھری باتوں میں سب بھول بھال گئی۔

وہ چوکلیٹ کھا رہی تھی اور شہباز خان سٹرونگ کوفی کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔

"اب تو فون پر بات کرو گی نا"۔

"ہاں"۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"اچھا اب کے پہلے تم کال کرو گی"۔

"ٹھیک ہے"۔

"کل رات دس بجے کے بعد"۔

کل وہ دونوں ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے، صبح ہی صبح۔ شام تک پہنچ جانا تھا انہوں نے۔ وہ ہمیشہ اسے رات دس بجے کے بعد فون کیا کرتا تھا۔ فری ہوتا تھا شاید اس وقت۔

"ٹھیک ہے"۔ اس نے پھر کہا۔

اس نے اسے بغور دیکھا۔ مسکرایا، دلآویزی سے۔

"آج ذرا۔۔۔ زیادہ فرمانبردار نہیں ہو"۔

وہ جزبز سی ہوئی۔

"ماروننگی میں"۔

"اچھا۔۔۔ یہ بھی ہوگا"۔

اسکے چہرے پر لالی بکھر گئی۔

"اچھا اب چلتی ہوں میں"۔

"کہاں؟" اس نے خالی مگ میز پر رکھا۔

"اپنے سویٹ"۔

"نہیں۔ اتنی جلدی بالکل نہیں"۔ اٹھتے ہوئے اس نے اسکا بھی ہاتھ تھام لیا۔

دونوں باہر آ گئے۔

اس وقت پھر بدلیاں منڈلا رہی تھیں، قدآور درخت برف کا لبادہ اوڑھے تھے، اور وادی میں زندگی ناپید لگ رہی تھی۔

"چلو۔ اس طرف چلتے ہیں"۔ اس نے دور دائیں طرف اشارہ کیا۔

وہ بے چوں و چرا ساتھ ہولی۔

نیچے سڑک پر اترتے کے بعد وہ دائیں طرف ہولئے۔ کچھ آگے چل کر دوبارہ اوپر چڑھنے لگے۔ وہ اسکا ہاتھ تھامے تھا۔ جگہ جگہ اونچ نیچ میں اسے سہارا دیتا جا رہا تھا۔ وہ اونچائی پر آ گئے۔ ستانے کو قدرے رک گئے۔

خوبصورت فر کے کوٹ میں وہ کسی رشین زار کی بیٹی لگ رہی تھی۔

"اتنی خوبصورت کیوں ہو ہاں"۔ وہ اسکی کاسنی مائیل حسین آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

اس نے بھی کچھ کہنے کو لب وا کئے۔ کہ وہ بھی تو گریک دیوتاؤں کو مات دیتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے یاد آیا اس نے اپنی تخلیق سے متعلق کوئی بھی بات کرنے سے اسے منع

کر دیا تھا۔

''بتاؤ نا''۔

''کیا بتاؤں''۔ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ اسکے خوبصورت لبوں کو چھو گئی۔

اسکی شرمیلی مسکراہٹ اور بھی حسین تھی۔ وہ بے بس سا اُسے تکتا رہا۔

''قدرت نے تمہیں خاص فرصت میں بنایا ہے''۔

وہ اسکی نظروں کا سامنا نہ کر پا رہی تھی۔

''چلیں اس طرف چلتے ہیں''۔ سرخ ہوتے ہوئے اس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

''نہیں اس طرف تو ہوٹیل ہے۔ اس طرف چلتے ہیں''۔ پھر سے اسکا ہاتھ تھامے ہوئے وہ مخالف سمت ہولیا۔

پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

''یہاں آگے ایک کوٹھی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ پچھلی بار آیا تھا تو دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا اگر کسی نے اسے بیچنا ہوا تو میں خرید لونگا۔ مگر اسکے اونر کا ہی پتہ نہیں چل رہا تھا''۔

وہ آگے بڑھنے لگے۔ نیچے چلڈرن پارک نظر آنے لگا تھا۔ انہوں نے ایک شورٹ کٹ لیا اور مقررہ جگہ پر آگئے۔

''... سکسٹین ... سیون ٹین ... اسکا نمبر اٹھارہ تھا مجھے یاد ہے...''۔

اور چلتے چلتے وہ دونوں کوٹھی کے سامنے آگئے۔

واقعی عالیشان تھی۔ پرانی اور سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ بیلیں اور خودرو جھاڑیاں اسے لپیٹ میں لئے تھیں۔ بے شمار قد آور درختوں میں گھری تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا مدتوں سے کوئی جھانکا نہیں تھا۔ خستہ حالت میں تھی اسکے باوجود شان شوکت اپنی جگہ تھی۔

وہ چاروں طرف سے گھوم پھر کر اسے دکھانے لگا۔ کوٹھی ایسی جگہ اونچائی پر واقع تھی کہ ہر سو قدرتی مناظر کی بھرمار تھی۔ بڑا کمانڈنگ ویو تھا۔ جیسے خوابوں کے دیس کا کوئی مسکن ہو۔

''یہ جب بھی بکے گی میں لونگا۔ ہم دونوں گرمیوں میں یہیں رہا کرینگے۔ ٹھیک ہے نا''۔

اس نے پھر اسے بغور دیکھا۔

اور وہ پھر نظریں چرانے لگی۔

یہیں سے وہ واپس پلٹنے لگا۔ آخر تو اس نے اپنی پھپھو کا بھی سامنا کرنا تھا۔ زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔

واپسی پر اس نے آج ایک بار پھر سولہ نمبر کے چوکیدار سے بات کی۔ شائی ادھر ادھر کے سحر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اور وہ چوکیدار سے اٹھارہ نمبر کے بارے میں بات کرتا رہا۔

''آؤ چلیں''۔ وہ مایوس سا بولا۔

''کچھ پتہ چلا''۔

''نو۔ کوٹھی کے مالک کا اب بھی کوئی پتہ نہیں...''۔

اونچی نیچی ڈھلانیں طے کرتے، برف کی پھسلن سے بچتے بچاتے وہ اوپر ہی اوپر سے ہوٹیل کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ پہلے شہباز خان کا سویٹ آتا تھا۔

''تمہیں سویٹ تک چھوڑ آؤں''۔ وہ اپنے سویٹ کے پچھواڑے رکتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ پھپھو دیکھ لیں گی''۔

''کب تک پھپھو سے چھپاؤ گی''۔ وہ شرارت سے بولا۔

''جب تک چھپ سکتا ہے''۔

''میں نے جا کر بتا دیا تو''۔

وہ بہت بولڈ تھا۔ جیسے آرام سے براہ راست فون پر پھپھو سے کہتا تھا شائی سے بات کرونگا اسی طرح یہ بات بھی بتا سکتا تھا۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا!

''آپ ایسا نہیں کرینگے''۔ وہ گھبرا کر بولی۔

''تمہارا نہیں بتاؤنگا اپنا بتاؤنگا''۔ اسے تنگ کرنے میں اسے مزا آرہا تھا۔

''نہیں''۔ وہ سفید پڑنے لگی۔

''اچھا نہیں۔ تم اتنی جلدی گھبرا کیوں جاتی ہو''۔ اسے اس پر ترس آگیا۔

شائی نے نجات کی سانس لی۔

''اچھا۔ میں چلتی ہوں''۔

''سی یو''۔ وہ بولا۔

اور اسے جاتے دیکھتا رہا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ آج پھر اسکی نگاہیں اپنے بیڈ روم کی بالکنی میں سے ہوتیں قریبی پہاڑی پر بنی فارسٹ والوں کے چوکیدار کی ملگجی پراسراری روشنی والی کوٹھڑی پر ٹکی تھیں۔

وہ اس وقت بے حد خوش تھا۔ شام کو شائی کے پاپا سے مل کر آ رہا تھا۔

اس نے آج صبح ہی ان سے شام سات بجے کا وقت لیا تھا، صرف آدھے گھنٹے کیلئے!

''میں آپکے پاس شائی کے بارے میں کہنے حاضر ہوا تھا''۔ وہ جلد ہی اپنے مطلب پر آ گیا تھا۔

''ہاں۔ مجھے بھی کچھ اندازہ تھا''۔ صلاح الدین صاحب بولے۔

کہ کچھ ہی عرصہ قبل اسکے گھر سے جو ماما آئی تھی وہ بھی یہی کہتی تھی، امیریکہ میں اس نے شائی کو دیکھا تھا اور پسند لیا تھا اور ——

آج دوپہر کو جب وہ ہسپتال سے گھر آئے۔ پھپھو سے اسکے ٹیلی فون کا ذکر کیا، بتایا کہ وہ شام سات بجے آ رہا ہے۔ تو انہوں نے بالکل ایک نیا انکشاف کیا۔

'شائی بھی شہباز خان کو چاہتی ہے'۔

تب سے اب تک وہ دم بخود تھے!

''مگر اسکے لئے پروپوزل دینے سے پہلے میں آپکو اپنے متعلق کچھ بتانا چاہونگا۔ میں... میں...''۔

پہروں سوچ سوچ کر، دل ہی دل میں بار بار دہراتا جس بات کیلئے وہ تیار ہو کر آیا تھا اس وقت پھر —— اپنے میں کہنے کا حوصلہ نہ پا سکا۔ دل زور سے دھڑکا اور ——

اپنے آگے رکھے پانی کے گلاس کیلئے ہاتھ بڑھایا تو مضبوط ہاتھ کانپ اٹھا۔

دو گھونٹ لے کر گلاس واپس رکھنے لگا تو یوں محسوس ہوا وہ میلوں بھاگ کر آیا تھا۔

حقیقت کتنی بھیانک تھی، کتنی ہولناک تھی۔

اعتراف حقیقت۔اعتراف قتل سے کہیں مشکل تھا!

اعتراف قتل ایک پل کی موت اور یہ اعتراف پل پل کی موت تھی۔وہ بھی بے عزتی کی، لعنت ملامت کی!

اسکی زندگی اور موت مجسم گالی تھی!

اس نے عرق آلود پیشانی انگلیوں سے پونچھی۔

''میں... جو... حقیقت ہے آپکو بتاؤنگا۔کسی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا آپکو۔ میں... ایک۔ناجائز اولاد ہوں...''۔

جانے کیسے اس نے یہ بات مکمل کی تھی۔

اسکی آواز شکست خوردہ تھی، نظریں ملامت زدہ۔

صلاح الدین صاحب کو اس پر ترس آ گیا۔کتنی اذیتوں سے گزر کر اس نے بات مکمل کی تھی۔جبکہ وہ ___

پہلے سے ہی اسکے بارے میں جانتے تھے یہ سب۔جبھی تو رشتہ دینے سے معذرت کر لی تھی۔معذرت اسلئے نہیں کی تھی۔کہ وہ ایک ناجائز اولاد تھا۔اس میں اسکا قصور نہیں تھا۔قصور اس مرد وعورت کا تھا جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔ناجائز وہ نہیں تھا۔ناجائز اسے جنم دینے والے تھے۔

انہوں نے اگر معذرت کی تھی تو صرف اسلئے کہ کل کو اس کیساتھ ساتھ انکی بیٹی اور اسکی اولاد کو بھی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں یہ طعنہ سننے کو ملنا تھا۔شائی بے حد حساس تھی، طعنہ شاید سہہ نہ پاتی۔پھر شہباز خان کی شادی تو کہیں بھی ہو سکتی تھی۔خواہ مخواہ شائی کو تردد میں ڈالنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔پر ___

دوپہر پھپھو سے پتہ چلا کہ شائی بھی اسے چاہتی تھی تو وہ دم بخود رہ گئے تھے۔

تمام دوپہر سوچا کئے۔

انہیں شائی سے اس قدر محبت تھی کہ آج تک اسکی کوئی خواہش رد نہیں کی تھی پھر یہ تو اس کی چاہت کا سوال تھا۔اسکی اہم ترین خواہش تھی!

وہ شش و پنج میں مبتلا تھے۔

کیا شائی اسکے بارے میں جانتی تھی؟ خیال آتے ہی انہوں نے شائی کو بلوا لیا۔

''بیٹا شہباز خان کے بارے میں تم کچھ جانتی بھی ہو''۔وہ براہ راست بولے۔

''جی پاپا''۔سر جھکائے وہ دھیرے سے بولی۔

''یہ بھی کہ... اسکا باپ... میرا مطلب ہے...''۔

''جی پاپا۔مجھے معلوم ہے''۔

''اوہ''۔وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔

''اسکے باوجود تم ___ اسکے حق میں ہو''۔

''جی پاپا''۔وہ پھر بولی، بہت ہمت کر کے۔

اسکے معصوم دل کو خوف تھا کہ وہ جھجک جاتی تو کھو دیتی اسے ___ وہ جو اسکی زندگی تھا!

سوچتے سوچتے ہی انہوں نے گہری سانس لی۔

''بیٹے۔کل کو تمہیں یا شہباز خان کو کوئی کسی قسم کا طعنہ وغیرہ دے تو ___ برداشت کر لوگی؟''

یہی طعنہ تو وہ اسکے ساتھ Share کرنا چاہتی تھی۔اکیلے سہتے سہتے وہ تو تھک گیا تھا ___ دونوں مل کر سہنے لگتے تو بوجھ ضرور کم ہو جاتا!

''کسی کا دکھ بانٹ لینا بھی خدا کی عبادت ہے پاپا''۔

اور ___ صلاح الدین صاحب اسے دیکھتے رہ گئے۔

چھوٹی سی شائی کتنی بڑی بات کہہ گئی تھی۔اور وہ اتنے بڑے ہو کر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دے رہے تھے۔

انہیں ندامت سی ہوئی۔ایک جیتے جاگتے انسان کو صرف اسلئے ٹھکرا دینا کہ وہ ایک ناجائز

اولاد تھا انصاف تھا کیا!

برے تو اسکے ماں باپ تھے اس نے کوئی برائی نہیں کی تھی۔

اپنے ماں باپ کی کہانی تو نہیں دہرائی تھی۔ بے عزت تو نہیں کیا تھا شائی کو۔ پروپوز کرنے آرہا تھا اسے۔ عزت دینے آرہا تھا اسے!

''بیٹا اگر تم سمجھتے ہو کہ شائی تمہیں کوئی خوشی دے سکتی ہے تو میں تم سے یہ خوشی چھینونگا نہیں''۔

شہباز خان نے ان کی طرف دیکھا۔

ملامت زدہ نظروں میں اعتماد بحال ہونے لگا۔ مجرمانہ انداز معدوم ہونے لگا۔

''مجھے یقین ہے شائی کو پالینے کے بعد میری زندگی کا انداز بدل جائیگا۔۔۔۔ میں جینا سیکھ لونگا''۔ اسکی آواز کی شکست فتح میں تبدیل ہورہی تھی۔

تبھی صاحبو ٹرالی میں چائے لےکر آگیا۔

''صاحبو آپا کو بھیجو''۔ صلاح الدین صاحب بولے۔

''جی صاحب''۔

ٹرالی ان کے آگے لگا کر صاحبو واپس چلا گیا۔

لمحوں میں ہی پھپھو اندر آگئیں۔

''آپا۔ شہباز خان کا منہ میٹھا کیجیے۔ شائی اب اس کی امانت ہے''۔

پھپھو مارے خوشی کے کچھ سمجھ نہ پارہی تھیں۔ بھاگی بھاگی اندر گئیں۔

مٹھائی نہیں ملی تو شائی سے طرح طرح کے ڈھیر سارے چوکلٹس کا خوبصورت ڈبہ اٹھا لائیں۔

''لیں بیٹا۔ منہ میٹھا کریں''۔ پھپھو نے ڈبہ اسکے آگے کردیا۔

''یوں نہیں آپا۔ منہ میں دیجیے۔ ہمیں اپنی ساس نے منہ میں مٹھائی دی تھی۔ شائی کی ممی ہم میں موجود نہیں ہیں۔ آپ ہی سب کچھ ہیں اب۔۔۔''۔

خوشی کے اس موقع پر اپنی چہیتی بیوی کی یاد نے صلاح الدین صاحب کو اداس کردیا۔

اور۔۔۔ پھپھو نے بسم اللہ کہہ کر ایک چوکلیٹ شہباز خان کے منہ میں دے دیا۔

شائی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

پھپھو اور صلاح الدین صاحب اسے چھوڑنے گاڑی تک آئے۔

بیٹھتے بیٹھتے اسکی نظر اوپر بالکنی پر پڑی۔

وہیں کھڑی شائی اسے چھپ کر دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی پردے کے پیچھے چھپ گئی۔

دلآویز مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور۔۔۔ گھر کیلئے روانہ ہوا۔

رات سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ سردی اعضاء شل کئے دے رہی تھی۔

موسم کی شدت سے بے نیاز وہ اپنے آرام دہ کوزی آفس میں بیٹھا ایک وکیل سے ضروری بات چیت میں مصروف تھا۔

چند کاغذات تھے، چند دستاویزات، جن کی نوعیت وہ وکیل اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور خود وہ انہیں سمجھنے کی تگ ودو میں تھا۔

معا فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکی عین توقع کے مطابق شائی تھی۔

''ہاں۔ بولو''۔

''آفس میں کوئی ہے کیا''۔ وہ اجنبیوں کی طرح بولتا تھا تو وہ سمجھ جاتی تھی ضرور آفس میں کوئی اور تھا۔

''ہاں''۔

''اچھا بعد میں رنگ کیجیئے گا''۔

''مشکل ہے''۔

''کیوں''۔ اسے حیرت سی ہوئی۔ ایسا اس نے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔

''ضروری کام ہے''۔

''کام کیا مجھ سے ضروری ہے''۔ اسے غصہ آ گیا۔

''ہاں۔۔۔ شاید''۔

اور شائی نے آگے سے فون ہی بند کر دیا۔

وہ پھر سے وکیل سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

دو ہی گھنٹے بعد وہ اسی وکیل کے ہمراہ محو پرواز تھا۔

اسکے دل ودماغ میں ہلچل برپا تھی۔

وہ کاغذات دو دستاویزات اسکے سیٹ کے پاس رکھے بریف کیس میں محفوظ تھے۔ وہ واضح ثبوت تھے اس عورت اور مرد کے جائز نکاح کے۔ جنہیں اپنا ماں باپ تصور کرنے سے بھی اسے کراہت آتی تھی۔ جنکے بارے میں خیال آتا تھا تو خون کھول اٹھتا تھا اُسکا، جنہیں تصور ہی تصور میں وہ کتنی بار گولیوں سے بھون چکا تھا!

اسکا سر گھوم رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوت مفقود ہو رہی تھی۔

نکاح نامے کے مطابق قریباً انتیس سال قبل اسکی ماں کا اسکے باپ کیساتھ نکاح ہوا تھا۔

گواہوں کے دستخط موجود تھے۔ جلی حروف میں عبدالجلیل اور سید ہاشم علی نمایاں لکھے تھے۔

اسکے باپ امجد علی اور ماں نغمانہ کے بھی اپنی اپنی ہینڈ رائیٹنگ میں سائین ہوئے ہوئے تھے۔

تب امجد علی کی عمر پچیس اور نغمانہ انیس سال کی تھیں۔

ہر چیز صاف لکھی ہوئی تھی۔ علاقے کے رجسٹرار کے دستخط بھی موجود تھے۔ کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

حق مہر میں نغمانہ کے ایک کوٹھی کے علاوہ کچھ اراضی بھی تھی۔ کوٹھی کا نمبر اٹھارہ اور علاقہ اسی ہل سٹیشن کا تھا جس سے چند ہی روز قبل وہ لوٹا تھا۔

اسکا بار بار اس کوٹھی کے پاس جانا۔ ایک مقناطیسی کشش کے تحت۔ کیا یہی وجہ تھی اسکی؟

باقی کاغذات اسکے باپ کی جائیداد کے تھے۔ ایک انکا چھوٹا سا گاؤں تھا ایک آبائی حویلی۔

وہ اکلوتے تھے، والدین کچھ عرصہ قبل چل بسے تھے۔

نغمانہ سے نکاح کر لینے کے دوسرے ہی دن امجد علی اپنی جاب پر حاضری کیلئے بس کے ذریعے جانے والے تھے مگر بوجوہ ارادہ بدل لیا اور ٹرین سے چل پڑے۔ ٹرین بیچ سفر

میں حادثے کا شکار ہوگئی۔ جانے کس طرح انہیں ہوش آیا تو وہ دشمن کے علاقے میں پائے گئے۔ بنا پوچھ گچھ ہی انہیں اور دو اور مسافروں کو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے اور جاسوسی کے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا۔

کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ بیوی کو الوداع کہی تھی تو وہ یہی سمجھی تھیں کہ وہ بس سے روانہ ہوئے ہیں اور یقیناً بعد میں کوئی خیر خبر نہ پاکر رو دھو کر چپ کر گئی ہونگی کہ انہوں نے ان سے بے وفائی کرلی۔

والدین کو تو سرے سے خبر ہی نہ تھی کہ انہوں نے نغمانہ سے نکاح کیا ہے۔ انکا خیال تھا جاب پر پہنچ کر اگلے ویک اینڈ پر گاؤں جا کر انہیں بتائینگے اور انہیں رضامند کرنے کی کوشش کرینگے۔

انکی طرف سے ایک عرصہ تک کوئی خبر نہ پاکر انہوں نے بھی انہیں زندہ یا مردہ گم پاکر دلوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہوگی۔

وہ سالہا سال جیل میں گلتے سڑتے رہے۔ کہ اچانک اپنی حکومت کی طرف سے انکی رہائی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ آخر کار انہیں رہائی نصیب ہوئی مگر ایسی کہ اس وقت وہ پاکستان کے ایک ہوسپٹل میں آخری سانسیں گن رہے تھے۔

شہباز خان کے پاس وکیل بمعہ ضروری دستاویزات کے انہوں نے ہی بھیجا تھا۔

لڑکھڑاتے سے قدموں، دھڑکتے دل اور ماؤف سے ذہن کیساتھ وہ وکیل کی ہمراہی میں انکے کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر بستر پر اسکے نحیف و نزار والد دراز تھے۔ نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ شاید اسی کے منتظر تھے۔

اس وقت ذہن میں سینکڑوں بار اٹھے سوال کا اسے جواب مل گیا۔ اسکی شکل اپنے باپ پر گئی تھی!

اور آج پہلی بار اسے فخر کا احساس ہوا۔

انکے سرہانے کھڑا ایک ادھیڑ عمر آدمی آگے بڑھا۔ اسے گلے لگایا۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔

"میں عبدالجلیل ہوں بیٹا۔ تمہارے والد کا دوست"۔ ساتھ ہی انکی آواز بھرا گئی۔ "آؤ

تمہارے والد کو بس تمہارا ہی انتظار تھا۔ شکر ہے زیادہ دیر نہیں ہوئی"۔

وہ گم سم سا انکے ساتھ ہولیا۔

"یہاں بیٹھو بیٹا۔ اپنے باپ کیساتھ۔ جب سے اسے پتہ چلا ہے تم بھی اس دنیا میں موجود ہو بے تاب ہو رہا ہے تمہیں دیکھنے کیلئے..."۔ وہ اپنے آنسو ضبط نہ کرسکے۔

وہ بستر پر انکے پہلو میں بیٹھ گیا۔ نظریں انکے کمزور چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

ظالموں نے کیسا ظلم ڈھایا تھا۔ دو دن کی بیاہتا بیوی سے، ماں باپ سے الگ رکھ کر کیسے ستم روا رکھے تھے۔ انکی بیوی پر کیا گزری ہوگی؟ کیسے کیسے دکھ اٹھائے ہونگے انہوں نے؟ اسکو جنم دے کر انہوں نے تو زندگی کی تلخیوں سے منہ موڑ لیا تھا پر ـــــ

اس انسان نے کیا قصور کیا تھا؟ اسے کس ناکردہ گناہ کی سزا ملی تھی؟ بے کسی، بے بسی اور اپنوں سے جدائی کے غم میں سالہا سال کیسے کاٹے ہونگے؟

اسے دیکھ کر انکی ماند پڑتی آنکھوں میں پل بھر کو زندگی کی رمق روشن ہوئی، پھر آنسو امڈ آئے، خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی ـــــ لرزتا کانپتا ہاتھ اسکے چہرے کی جانب بڑھنے لگا۔

"بابا ـــــ بے اختیار وہ انکا کانپتا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر چومنے لگا۔

پھر ـــــ وہ چونکا ـــــ انکا ہاتھ اسکی گرفت سے نکلنے لگا تھا۔ بے جان پڑ گیا تھا۔ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی تھی!

"بابا"۔ انکے سینے پر سر رکھ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اپنے بابا کی میت لے کر وہ اپنے آبائی گاؤں پہنچا تو تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مردانے میں بے شمار اجنبی چہروں کے درمیان اسے اپنے دوست واحباب نظر آئے، اپنا سٹاف، صلاح الدین صاحب، فاروق نظر آئے۔ اندر گیا تو بیسیوں ناآشنا رشتہ دار عورتوں میں ایک طرف پھپھو اور سامنے نانو روتی بلکتی نظر آئیں۔

نانو سے لپٹ کر وہ بہت رویا۔ قدرت نے کتنی کنجوسی سے ان دونوں کو امجد علی کی صورت

دکھائی تھی مگر۔

فوراً ہی اسے اپنی ناشکری کا احساس ہوا۔قدرت تو بہت مہربان تھی، بہت شفیق۔۔۔ اسکے ہوسپٹل پہنچنے کی اسکی منتظر رہی، باپ بیٹے کو ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے کی مہلت دی، وہ انہیں 'بابا' کہہ کر پکار سکا۔کیا یہ کم تھا؟

وہ اپنے باپ کے جنازے کو کندھا دیئے تھا۔اسکے باوجود اسکے چہرے پر اطمینان تھا۔ اسکا سر فخر سے بلند تھا کہ۔۔۔ وہ اسکا باپ تھا!

''صلاح الدین بیٹا۔۔۔ شائی کیلئے میں تمہاری بہت مشکور ہوں۔وہ میرے شاہ جان کی پسند ہے۔بس اب تو دن گن رہی ہوں کہ کب اسے اپنے گھر لے کر جاؤنگی''۔

امجد علی کو گزرے چالیس دن پورے ہو چکے تھے۔نانو پہلی بار صلاح الدین صاحب کے یہاں آئی تھیں۔۔بہت خوش تھیں۔شہباز خان بھی ساتھ تھا۔

ابھی چند منٹ پہلے ہی وہ شائی کے کمرے میں اسے یہ بڑی ہیرے کی انگوٹھی پہنا کر آرہی تھیں۔بہت پیاری لگی تھی انہیں وہ۔کیا شکل وصورت کیا ناز وانداز، سبھی تو بھاگئے تھے انہیں۔اپنے شاہ جان کی پسند کی داد دے رہی تھیں دل ہی دل میں۔

''شائی اب آپکی امانت ہے۔میں اکیلا ضرور پڑ جاؤنگا۔مگر جانتا ہوں بیٹی کا باپ ہوں۔ اسے کسی نہ کسی دن اپنے گھر تو جانا ہی ہے۔۔۔''۔

''دل چھوٹا مت کرو بیٹا۔جب جی چاہے بلالیا کرو، جب دل چاہے ملنے آجایا کرو۔ ہم دور تھوڑی رہتے ہیں''۔انہوں نے قدرے توقف کیا۔شہباز خان کی طرف دیکھا۔

''شائی کے متعلق شاہ جان سے سنا تو تھا آج دیکھ بھی لیا۔جیسا سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ امجد علی کے واقعہ نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔کسی خوشی کی ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں آرہی۔دل میں بڑے ارمان تھے۔۔۔''۔وہ اداس نظر آنے لگیں۔

''قدرت کے قانون اٹل ہیں۔انسان اسکے آگے بے بس ہے''۔صلاح الدین صاحب بولے۔

تبھی چائے آگئی۔پھپھو نے آج خاص اہتمام کیا تھا سمدھی جو آرہے تھے۔

پہلے سب کو خوشی خوشی مٹھائی پیش کی۔پھر باری باری باقی چیزیں۔

''پہلے تو میرا خیال تھا سادگی سے سب کرونگی۔ بہت کوفت ہوتی ہے مجھے شور شرابے سے''۔ وہ اپنی پلیٹ میں کباب کا پیس لیتے ہوئے بولیں۔ ''مگر اب ارادہ بدل لیا ہے۔ اب خوب دل کے ارمان نکالوں گی۔ میری نعمانہ کی شادی پر نہ کوئی دستور ہوا نہ کوئی رسم نہ رواج۔ نہ سہیلیاں اکٹھی ہوئیں نہ ڈھولک بجی''۔ وہ رو دیں۔ ''شاہ جان کی... شادی پر اب ساری کسر نکالونگی۔ چھوٹے سے چھوٹا دستور پورا کرونگی۔ اللہ پاک شائی کے دل کی مرادیں پوری کرے۔ میرا شاہ جان بھی خوشیاں دیکھے...''۔

وہ خوش بھی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔

شہباز خان اپنی جگہ سے اٹھ کر انکے پاس آ بیٹھا۔ انکے آنسو پونچھے۔

''پلیز نانو۔ اور نہیں۔ دیکھیں آپکو ڈاکٹر نے منع بھی کیا ہے''۔

وہ انکی دلی کیفیت بخوبی جانتا تھا۔ مگر کیا کرتا۔ وہ تو گھر میں بھی بات بات پر رو پڑتی تھیں۔ اٹھائیس برسوں کا غبار جو جمع تھا دل پر۔

''نہیں بیٹا۔ میں کب رو رہی ہوں''۔ وہ روتے میں مسکرا دیں۔ ''یہ بھلا کوئی رونے کا موقعہ ہے۔ میں تو خوش ہوں بہت زیادہ۔ نعمانہ کی ساری کمی میں شائی پر پوری کرونگی''۔

اور شہباز خان نے انکا سر سینے سے لگا لیا۔

''جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہوگا نانو''۔ اس نے انہیں بچوں کی طرح تسلی دی۔

نانو آئی تو تھیں کوئی مناسب تاریخ مقرر کرنے رخصتی کی۔ مگر صلاح الدین صاحب نے شہباز خان کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی کچھ عرصہ انتظار کیا جائے۔ کیونکہ نانو کی حالت ابھی اس قابل نہ تھی کہ شور شرابا اور جسمانی و ذہنی تھکن برداشت کر سکتیں۔

''انہیں واقعی اس المناک حادثے نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اٹھائیس طویل سال اپنی جوانمرگ اولاد کو یاد کرنے کو بھی لب سلے رکھے تھے کہ سوچتی تھیں کالک تھوپ دی تھی انکی عزت پر۔ اٹھائیس سال تک وہ شہباز خان کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھتے رکھتے تھک چکی تھیں۔ یہ بھید شہباز خان سے خفیہ رکھتے رکھتے نڈھال ہو چکی تھیں۔

اب اچانک پتہ چلا کہ اس نے تو حلال نکاح کیا تھا۔ خدا اور شریعت کی نظروں میں بے گناہ تھی تو دکھ برداشت سے باہر ہو چلا تھا۔ سارا سارا وقت بیٹی کو یاد کر کر کے روتی رہتی تھیں۔

واپسی پر ایک بار پھر نانو شائی کو دیکھنے گئیں۔ اب تو اسے نظروں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی انکے شاہ جان کی محبت میں!

پھپھو اور صلاح الدین صاحب ان کیساتھ گاڑی تک آنے لگے۔

شہباز خان بے چین سا نظر آنے لگا۔ اب تک شائی جو نظر نہیں آئی تھی اسے۔

''پھپھو ـــ شائی نظر نہیں آئی''۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

''وہ اب پردہ کرے گی آپ سے۔ ہمارا دستور ہے لڑکی منگنی کے بعد پردہ کرتی ہے لڑکے سے''۔ پھپھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شہباز خان پریشان سا سب کو دیکھنے لگا۔

'میرے شاہ جان پر یہ پابندی کبھی مت لگانا''۔ نانو کہاں اپنے شاہ جان کو پریشان دیکھ سکتی تھیں۔

''جیسی آپکی مرضی بیگم صاحبہ''۔ پھپھو خوش دلی سے بولیں۔

پچھلی سیٹ پر پہلے نانو بیٹھیں پھر شہباز خان۔ ڈرائیور نے انکا دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

گرمیوں کا بس آغاز ہی ہوا تھا۔دن بڑے راتیں گھٹنا شروع ہوگئی تھیں۔درختوں پودوں میں سرسراتی ہوا بھلی لگتی تھی۔

بوگن ولا کے آتشی گلابی،سرخ،سنہرے پھول جوبن پر تھے،موتیا کی کلیاں بس اب کھلیں کہ اب،سیاہی مائیل سرخ کارنیشن الگ بہار دکھارہے تھے۔اور خوبصورت پتوں سے لدے پھندے چنار دور دور تک سایہ کیئے ہوئے تھے۔

نانو کے ارمان اتارنے کے دن آہی پہنچے تھے۔خود نانو کو کبھی رسم و دستور سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی اسلیئے زیادہ واقف نہ تھیں۔

بس پھپھو بتاتی جاتیں اور وہ کرتی جاتیں۔

دنوں پہلے محفلیں جمنے لگی تھیں۔خوب خوب رونق تھی دونوں گھروں میں۔شہباز خان کا سائیڈ فاروق اسکی امی اور بہنوں نے سنبھالا ہوا تھا جبکہ شائی کے یہاں پھپھو اور شائی کی سہیلیوں نے سب انتظام ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔

نادیہ کو بلانے شائی خود گئی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔کہتی تھی مہندی پر ہی آئیگی۔

پھر مہندی کی رات بھی آگئی۔

لڑکے والوں نے اپنے پہنچنے کی اطلاع زبردست فائرنگ سے کی۔لڑکی والوں نے بھی شایان شان استقبال کیا۔

شائی کے گھر کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کیئے دیتی تھی۔

وسیع و عریض لان میں مردوں کا الگ اور عورتوں کے الگ بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔سب مہمانوں کو نہایت احترام اور سلیقے سے بٹھایا گیا۔ٹھنڈے مشروبات سے تواضع کی گئی۔

پھر سجی سجائی مہندی کی تھالیوں کیساتھ میوزک پر رقص ہونے لگے۔خوشیوں کا نور امڈ آیا تھا ہر طرف۔زبردست آتش بازی ہوتی رہی۔وقفے وقفے سے فائرنگ بھی۔

پھر دولہا کو اپنے چند خاص دوستوں کی ہمراہی میں اندر خواتین کی طرف لایا جانے لگا۔

شہباز خان اپنا روایتی لباس شلوار قمیض اور علاقائی چپلی پہنے بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

''کیسا لگ رہا ہے''۔فاروق نے شہباز خان سے پوچھا۔

''میں نروس ہورہا ہوں اور تم پوچھتے ہو کیسا لگ رہا ہے''۔وہ واقعی ہر طرف سے اپنے اوپر پڑتی خواتین کی نظروں سے نروس ہورہا تھا۔

''تم ہی کہتے تھے دستور اچھے لگتے ہیں''۔

''میرا تو خیال تھا صرف شائی کیساتھ دستور ہونگے۔مجھے کیا پتہ تھا میری بھی سکریننگ ہوگی''۔

''تم اکثر بہت غلط سوچتے ہو''۔

''فاروق میں۔۔۔خواتین سے بہت گھبراتا ہوں۔خاص کر پاکستانی خواتین سے۔۔۔''۔

دھیرے دھیرے کہتا وہ دوستوں کے جلو میں چلا آرہا تھا۔

سامنے ہی شائی رشتہ داروں اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں پیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس گھونگھٹ نکالے سٹیج پر بیٹھی تھی۔

''اور۔۔۔اس بچاری کو کیوں اتنی مصیبت میں ڈالا ہے ان لوگوں نے''۔شائی پر نظریں پڑتے ہی اس نے فاروق سے کہا۔

''دلہن تو بننا پڑتا ہے نا۔شادی یوں ہی تھوڑی ہوجاتی ہے''۔فاروق نے اسے سمجھایا۔کیونکہ۔۔۔

اس نے بہتیری شادیاں دیکھی تھیں۔اور سب میں یہی کچھ ہوتا تھا۔البتہ شہباز خان کیلیئے یہ سب بالکل نیا تھا۔پہلا تجربہ تھا اور وہ بھی اپنے اوپر!

بالآخر اسے سٹیج پر شائی کے پاس بٹھایا گیا۔شائی کا سر اور بھی جھک گیا۔

"اسکی گردن تھک جائیگی"۔ شہباز خان اپنے بالکل پیچھے کھڑے صوفے کی پشت تھامے فاروق سے تشویش سے بولا۔

لڑکیوں نے شور مچادیا۔ سیٹیوں کی بھی آوازیں آئیں۔

شہباز خان واقعی نروس ہونے لگا۔ یہ تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

"بڑا خیال ہے مسٹر شہباز خان کو اپنی دلہن کا"۔

ایک چبھتا سا فقرہ سنائی دیا۔ آواز جانی پہچانی سی تھی۔

شہباز خان اور فاروق نے بیک وقت دیکھا۔ سامنے ہی نادیہ کھڑی کسی لڑکی سے کہہ رہی تھی۔

"اب ہم ڈانس کرینگے۔ پھپھو لڑکیوں سے کہیں ہمیں جگہ دیں"۔ شہباز خان کا ایک اور دوست سلمان بولا۔

پھپھو نے سٹیج کے سامنے جگہ خالی کروالی۔

"ضروری ہے تم لوگ ڈانس کرو"۔ شہباز خان بولا۔ ان سب کی وجہ سے اسے مورل سپورٹ بھی تو حاصل تھی۔

"دولہا کو اکیلے بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا ہے شاید"۔ پھر نادیہ بولی تھی۔

شہباز خان نے نظر انداز کردیا۔ آج وہ کچھ بھی کہہ سکتی تھی۔

تمام لڑکے درمیان میں آئے۔ وہ بھنگڑا ڈالا، کہ دیکھنے والوں کے دل خوش ہوگئے۔

بعد میں انگریزی دھن پر بھی دیر تک سلمان اور فاروق رقص کرتے رہے۔

پھر۔۔۔ تھک تھکا کر دوبارہ سب شہباز خان اور شائی کے صوفے کے پیچھے سمٹ آئے۔

"بیگم صاحبہ۔ چوٹی کون کھولے شائی کی؟" پاس بیٹھیں پھپھو نے شہباز خان کے قریب صوفے پر بیٹھیں نانو سے پوچھا۔

دستور کے مطابق ایک دن پہلے لڑکی کے گھر والے اس کے بالوں میں ایک پتلی سی چوٹی گوندھ دیتے تھے۔ اگلی رات مہندی پر اس چوٹی کو لڑکی کے دیور نے کھولنا ہوتا تھا۔ اب دیور

چونکہ تھا نہیں مسئلہ نانو کے سامنے رکھ دیا گیا۔

"فاروق کھول دے گا۔ وہی دیور ہے نا"۔ نانو بولیں۔

"نہیں۔ شہباز خود کھولے گا"۔ فاروق جلدی سے بولا۔

"ہاں دولہا خود کھولے۔ دولہا خود کھولے"۔ ہر طرف سے شور اٹھا۔

"...You"۔ شہباز خان نے اسے گھورا۔ بہت دلیر سہی مگر یہ کام اسکے بس کا نہیں تھا۔

"بسم اللہ کرو شہباز"۔ فاروق نے اسکی نظریں نظر انداز کردیں۔

"کیا کروں"۔ وہ پریشان سا بولا۔

"ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں"۔ فاروق نے کہا۔

کیا لڑکیاں کیا عورتیں سبھی سٹیج کے اردگرد سمٹ آئیں۔ ایک دوسرے کے کندھوں میں سے جھانک کر دیکھنے لگیں۔ لڑکا خود چوٹی کھولے، یہ دستور کچھ نیا سا تھا۔

"پھپھو۔۔۔ چوٹی کس طرف ہے"۔ فاروق پوچھنے لگا۔

پھپھو نے ایک طرف سے شائی کا گھونگھٹ پلٹ کر چوٹی ان دونوں کے سامنے کردی۔ جان بوجھ کر باریک سی چوٹی گوندھی گئی تھی۔ تا کہ کھولنے میں وقت پیش آئے اور زیادہ سے زیادہ وقت لگے۔

"یہ۔۔۔ یہ میں کیسے کھولونگا"۔ وہ واقعی گھبرا گیا۔

ایک بار پھر شور اٹھا۔ ہوٹنگ ہوئی۔

"چلو بیٹا شروع کرو"۔ نانو نے اسکی ہمت بندھائی۔

"Wish me luck Shy." شہباز خان نے کہا اور سنہری گوٹے کی گرہ کھول لی۔

خوب تالیاں بجیں، خوب شور بلند ہوا۔ کچھ اسکی بات پر کچھ گرہ کھولنے پر۔

پھر۔۔۔ دلہن کو لگانے کیلئے مہندی لائی گئی۔

اب تک شہباز خان سنبھل چکا تھا۔ دلچسپی سے سب دیکھ رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ آپ خود مہندی لگائیں"۔ پھپھو نے پیشکش کی۔

"یہ بھی دولہا صاحب ہی لگا دیں تو بہتر ہوگا"۔ نادیہ کی پھر ایک چوٹ کھائی آواز سنائی دی۔

"لگاؤں"۔ شہباز خان نے سوچا ایسا بھی ہوتا ہوگا۔

"نہیں۔ ہر کام تم نہیں کرو گے"۔ فاروق نے اونچی آواز میں ڈانٹا۔

ایک بار پھر خوب قہقہے بلند ہوئے۔

نانو کچھ جھجک سی رہی تھیں۔ انکا خیال تھا کہ کوئی سہاگن ہی یہ کام سرانجام دے۔ پھپھو سمجھ گئیں۔

"بیگم صاحبہ۔ مہندی آپ ہی لگائیں گی"۔ انہوں نے خوبصورت تھالی میں سجی مہندی انکے آگے کردی۔ کہ اس خوشی پر سب سے زیادہ ان ہی کا حق تھا!

'بسم اللہ' کہہ کر انہوں نے شائی کی ہتھیلی پر مہندی لگا دی۔

تبھی کھانا لگ جانے کی اطلاع ہوئی۔

پھپھو نانو کو سٹیج سے اتارتیں ساتھ لے گئیں۔ باقی خواتین بھی چل دیں۔ نادیہ بھی اپنی ساتھی لڑکی کو ساتھ لئے وہاں سے چلی گئی۔ مگر باقی سب لڑکیاں اب بھی دولہا دلہن کو گھیرے میں لئے تھیں۔

"چلو اب اٹھو"۔ فاروق نے شہباز خان سے کہا۔

"میں بھی جاؤں""۔

"اور نہیں تو کیا رات گزارو گے یہاں"۔

لڑکیاں ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔ ایسا انجان دولہا انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"شائی بھی تو بیٹھی ہے"۔

اور فاروق نے ہاتھ ماتھے پر مارا۔

"ہمیں کس نے کہا تھا اسے اندر لانے کو"۔

شہباز خان ہنس دیا۔ بہت خوبصورتی سے۔

"میرا دل نہیں کر رہا جانے کو"۔

"دل تمہارے پاس ہے کہاں"۔ وہ تو بھابی کی مٹھی میں ہے"۔ سلمان بولا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے"۔

اور فاروق اور سلمان نے اسے زبردستی اٹھالیا۔

"پہلے آ نہیں رہا تھا اب جا نہیں رہا"۔ سلمان بولا۔

لڑکیاں بھی کھانا کھانے چل دیں۔ اور یوں مہندی کی رسم اختتام کو پہنچی۔

وہ دونوں ہنی مون کیلئے پہاڑ پر آئے تھے۔اسی اٹھارہ نمبر کی کوٹھی میں۔

مرمت کے بعد کوٹھی اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔بیکار کی جھاڑیاں اور فالتو بیلیں صاف کر دی گئی تھیں۔پائینز کے پرجلال درخت اپنی جگہ تھے اور حسب معمول آوارہ بادل ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔

گیارہ بجنے کو تھے۔بستر پر لیٹے لیٹے شہباز خان کی آنکھ لگ گئی تھی۔شائی اس کیلئے کچن میں کوفی بنا رہی تھی۔

مگ میں کوفی پھینٹتے پھینٹتے وہ کھڑکی میں سے سامنے دیکھتی پچھلے دنوں کو یاد کر رہی تھی۔

وہ اسے دیو مالائی کہانیوں کا شہزادہ لگتا تھا، کوئی گریک گوڈ، ایک جہاں پناہ!

کتنی عجیب بات تھی، آج وہی دیو مالائی کہانیوں کا شہزادہ اسے مل گیا تھا، وہی گریک گوڈ اسکا اپنا تھا۔وہی جہاں پناہ اسکی روح تھا۔پھر ___

اسے اس سے بھی زیادہ عجیب احساس ہوا۔وہ بھی کتنا چاہتا تھا اس کو ___ بے اندازہ، بے تحاشہ، بے پناہ!

وہ اپنے آپکو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی تھی جسے شوہر کا اتنا پیار میسر تھا۔

پانی ابل چکا تو اس نے مگ میں ڈالا اور تھوڑا سا دودھ اور ہلکی سی چینی ملاتے ہوئے بیڈ روم میں آ گئی۔

''کوفی جہاں پناہ!'' بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتی وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

شہباز خان کی نیند کبھی گہری نہیں تھی۔فوراً جاگ پڑا

اسکے تخاطب پر مسکرا دیا۔وہ یوں ہی اسے کبھی 'سر' کبھی 'یور ہائی نس' اور آج 'جہاں پناہ'

کہہ رہی تھی۔

اس نے دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ لئے۔

''میں اتنا خوبصورت خواب دیکھ رہا تھا'' اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔''بہت Important بھی''۔

''مجھ سے بھی Important''۔

''آں ___ شاید ___ بس تقریباً تم جتنا ہی Important''۔اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا مطلب؟'' وہ بس ناراض ہونے کو تھی۔

''سنو سنو''۔وہ اب بھی اسے بازوؤں میں لئے تھا۔

''میں دیکھ رہا تھا کہ ___ ہمارا بیٹا ہے...''۔

اور شائی سرخ ہو گئی۔کیا الٹی سیدھی بولتا تھا بعض اوقات۔

''پتہ ہے بڑا پیارا تھا۔تقریباً چار سال کا''۔

اور شائی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم اور میں ___ یہیں باہر برف میں اس کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔تم برف کا گولہ بنا کر مجھ پر پھینکتی ہو۔اسے غصہ آ جاتا ہے اور وہ گولہ بنا کر تم پر پھینکتا ہے۔

''مما کیوں بابا کو مارا''۔

''واہ۔ابھی سے بابا کا سائیڈ''۔شائی بے اختیار بولی۔

''بابا تو بابا ہوتا ہے''۔شہباز خان بولا۔

''بابا تو بابا ہوتا ہے''۔شائی نے اسی کے لہجے میں اسکی نقل [illegible]۔

وہ ہنس دیا۔دلآویزی سے۔

''تم آگے سے کہتی ہو۔بیٹا بابا گندے ہیں اسلئے مارا''۔

اور وہ بھاگتا ہوا آ کر مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔

''میرے بابا اچھے ہیں' بہت اچھے ہیں''۔

میں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اسکے گال پر پیار کیا۔

''تمہارے بابا کا کیانام ہے بیٹا''۔ میں نے پوچھا۔

''شہباز خان''۔ وہ بولا۔

''اور تمہارے بابا کے بابا کا کیانام ہے''۔

''امجد علی''۔ وہ بہت فخر سے بولا۔

اور میں نے اسے بے تحاشہ چومنا شروع کر دیا۔

شانی نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اسکے لاشعور میں پچھلے واقعات اس قدر رچ بس گئے تھے کہ وہ خوابوں میں بھی اپنے جائز ہونے کی تصدیق چاہتا تھا۔ سپنے میں بھی اپنے بیٹے کو لئے دادا کا نام رٹوا دیا تھا۔ اور پھر اس کی ننھی سی زبان سے سننا چاہتا تھا کہ اسکے بابا کا بھی بابا تھا جسکا نام امجد علی تھا۔

آج پھر اسے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ بھول کیوں نہیں جاتا پچھلی باتیں!

''ہمارا بیٹا بہت پیارا تھا''۔

''شکل کس پر گئی تھی''۔ شانی نے پوچھا۔

''ظاہر ہے اپنے بابا پر''۔

''واہ۔ بس بابا ہی بابا۔ مما کچھ نہیں''۔

''وہ تو وہی آکر بتائیگا''۔ وہ شریر نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو۔

شانی کو احساس ہوا۔ اسکی باتوں میں آکر وہ بھی تو الٹا سیدھا بولنے لگی تھی۔

سرخ ہوتے ہوئے اس نے نظریں جھکالیں۔ اور شہباز خان تکیے بستر کی پشت سے ٹکاتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے اپنی کوفی اٹھالی۔

''ٹھنڈی [illegible] ہے''۔ وہ گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

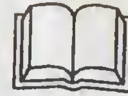
''اور بنادوں''۔

''نہیں۔ تم نہیں''۔

''پھر''۔

''وہ ــــ ہمارا بیٹا بنادیگا''۔ اس نے مگ واپس رکھ دیا۔

پھر ــــ نہایت آہستگی سے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ جیسے وہ کوئی نازک پھول تھی جسکے مرجھا جانے کا خدشہ تھا، جیسے کانچ کی چوڑی تھی جسکے ٹوٹ جانیکا اندیشہ تھا!



○ اپنے بالکل سامنے بیٹھے اس آدمی نے کچھ عرصہ قبل اسے ائرپورٹ سے اغواء کرایا تھا، قید میں رکھا تھا، پھر جگہ جگہ اسکی بنی بنائی نوکری سے اسے جواب دلوایا تھا، کسی بھی شہر میں اسے ٹکنے نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسکے خیال میں ___ واپس بیرون ملک چلی گئی تھی۔

کون یقین کرسکتا تھا اس پر؟

اسکی سمیشنگ پرسنیلٹی، بردباری، انداز گفتگو ___ کہیں بھی تو مجرمانہ رمق نہیں پائی جاتی تھی

○ ... وہ اسے قہر و غضب والا، جلد جھپٹ پڑنے والا لگا۔

''بھئی کوئی غصہ دلائیگا تو ہم جھگڑے کا نہیں تو اور کیا کریگا''۔ اسکے چہرے پر معصومیت تھی۔

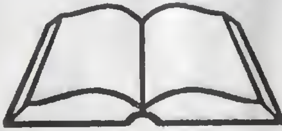
''دیکھو۔ ہم خود سے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑا نہیں کرتا ___ لیکن اگر کوئی کمینگی کرتا ہے۔ تنگ کرتا ہے تو اسکو ہم ضرور سیدھا کرتا ہے اس کیلئے چاہے فائر کرنا پڑے...''۔

نی شے کے چہرے کی سرخی ماند پڑ گئی۔ ایک بار پھر دبے ہوئے اندیشے جاگ اٹھے۔

اگر کسی دن وہ اسے پہچان گیا تو؟

کیا ردعمل ہوگا اسکا؟ کیا فائر؟...

سہمی سہمی، ڈری ڈری، محبت کی یہ لازوال داستان 'دُھند' آمنہ اقبال احمد کی ایک اور حسین پیشکش ہے۔



☆ ''آ.....آ.....پ؟'' زبان کے ساتھ ساتھ اُس کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔

کینڈلز کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا اُسکا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

''مجھے جانِ عالم کہتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''جی!'' وہ بے یقینی سے اُسے دیکھنے لگی۔

اگر یہ رات والا آدمی تھا۔ تو پھر اتنا اجنبی بن کر کیوں مل رہا تھا؟ اور اگر یہ......

☆ ''میں پاکستانی جنگی قیدی ہوں بابا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

اور...... بوڑھا آدمی اچھل کر رہ گیا۔

اور پھر... اُسے لگا۔ جیسے وہ اپنے گھر کے گیسٹ روم میں نہیں، بھوتوں کے مسکن میں آ گیا تھا۔ وہ لڑکی...... بلاشبہ وہی لڑکی......

☆ ''پاکستانی جنگی قیدی فرار ہو گیا۔ اخبار۔ اخبار۔ آج کی تازہ خبر......''

وہ اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ کسی سٹیشن پر شاید ٹرین رکی تھی۔ اخبار بیچنے والا لڑکا ہر کھڑکی میں اخبار گھسائے دے رہا تھا۔

''ہم فوجیوں کی بھی کیا زندگی ہے۔ امن ہو تو لڑکیوں کا آئیڈیل۔ اور...... اور...... جنگ ہو تو......''

ایک فوجی کی زندگی میں جہاں جنگ ناگزیر ہے وہاں ایک حسین لڑکی بھی لازم و ملزوم ہے۔ جنگ ہو تو بندوق چلاتا ہے، امن ہو تو اپنی محبوبہ کی ناز برداریاں اٹھاتا ہے۔

آج کی مقبول ترین مصنفہ آمنہ اقبال احمد کی اولین پیشکش ''ذھینہ'' ایک نوجوان فوجی افسر کی تیز و تند محبت کی خوبصورت کہانی ہے۔ دشمن کی قید سے فرار کی پُر خطر مگر دلچسپ داستان ہے۔